تحریک فیضان لوح و قلم: محمد ساجد رضا قادری رضوی

سنبھل

کے

چند اکابر علما و مجاہدین آزادی

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی
سربراہ شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کالج سنبھل

سنبھل کے چند اکابر علما
ومجاہدین آزادی

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، ایم. لٹ. پی. ایچ. ڈی (گولڈ میڈیسٹ)
سربراہ شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کالج سنبھل

نام مصنف :- ڈاکٹر سعادت علی صدیقی - ولدیت، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
تاریخ پیدائش :- لکھنؤ ۱۵ مارچ ۱۹۴۵ء
تعلیم :- بی. اے. آنرس، لکھنؤ یونیورسٹی. فرسٹ ڈویژن
ایم. اے اسپیشل. لکھنؤ یونیورسٹی فرسٹ ڈویژن. فرسٹ پوزیشن
پی ایچ ڈی - لکھنؤ یونیورسٹی. موضوع "اردو کا زندانی ادب"
مشاغل و سرگرمیاں :- تصنیف و تالیف، درس و تدریس. چیرمین اتر پردیش اردو
تعلیمی جائزہ کمیٹی - صدر - عاشق پبلک لائبریری سنبھل - رکن - یوپی گورنمنٹ
اردو مشاورتی بورڈ - شریک مدیر ماہنامہ فروغ لکھنؤ۔

پیشہ :- ریڈر و سربراہ شعبہ اردو (۱۹۷۱ سے)
مہاتما گاندھی کالج سنبھل

نام کتاب :- سنبھل کے چند اکابر علما و مجاہدین آزادی
سن اشاعت :- سنہ ۱۹۹۰ء
تعداد اشاعت :- ایک ہزار
قیمت :- تیس روپے
تقسیم کار :- اردو گھر ۱۵۶ اشفاق اللہ روڈ لکھنؤ ۱۸
۲- دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۸
۳- اردو گھر راؤز ایوینو، نئی دہلی ۲
۴- "گوشہ شجاعت سندیلوی"
عاشق پبلک لائبریری سنبھل ۲۴۴۳۰۲

ترتیب

مولانا محمد اسماعیل
حافظ سلطان احمد
حافظ نور الحسن
مولانا عبد القیوم
ضمیمہ
شیخ تاج الدین سنبھلی

گزارش احوال واقعی

"سنبھل" علم و ادب کا گہوارہ تو کبھی نہیں رہا۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہاں پر کسی زمانے میں کوئی رئیس یا امیر علم و ادب کا مربی نہ ہوا۔ نہ کوئی ایسی دریا دل اور فیاض ہستی ہوئی جو شعرا کی فکر قوت لایموت سے آزاد کر کے پرورش علم و ادب کا کارنمایاں انجام دیتی مگر حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے یگانہ روزگار فن اس سرزمین پر پیدا ہوتے رہے۔ خدا کی کارسازی کے قربان جایئے کہ بغیر کسی ظاہری یا دنیوی سہارے کے اس تنزل پذیر شہر میں ایسی گراں قدر ہستیاں وجود میں آئیں، جن کے کارنامے رہتی دنیا تک صفحۂ گیتی سے محو نہ ہوسکیں گے"۔[1]

ڈاکٹر صابر حسین صابر سنبھلی کی اس رائے سے کہ سنبھل علم و ادب کا گہوارہ کبھی نہیں رہا، اتفاق یا اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نقطہ نظر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ سنبھل ماضی بعید میں علم و دانش کا اہم ترین مرکز رہا ہے اور اس مردم خیز خطے میں ایک سے بڑھ کر ایک جید عالم، اکابر علما اور ممتاز فن کار پیدا ہوئے، جن کے کارنامے ناقابل فراموش اور خدمات فقید المثال ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے، انھیں یاد کیا جاتا رہے گا۔

روہیل کھنڈ جیسے تاریخ ساز خطے کے ضلع مرادآباد سے

۲۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر آباد قدیم ترین قصبہ سنبھل عہد قدیم میں منفرد و ممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے۔ مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں تو اسے مرکزی مقام حاصل تھا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں بھی اس کا ذکر فخر و مباہات کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ پرتھوی راج چوہان کے نانا راجہ جگات جب کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس نے اسی علاقہ میں آکر غسل کیا اور صحت یاب ہوا۔ اس وقت اس کی حیثیت بیابان کی تھی۔ راجہ نے واقف کار بزرگوں سے اس خطہ کا نام پوچھا تو انھوں نے جواب دیا "سنبھلا گرام"۔ راجہ جگات نے جو سرتھل کا ساکن تھا اسے آباد کرنے کا فیصلہ کیا اور یہاں ایک قلعہ کی تعمیر کی۔ اس نے سنبھل کو ۱۶ پورہ اور ۱۸۴ محلوں پر بسایا تھا۔ جس کا رقبہ ۲۶ کوس تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق سنبھلا گرام مختلف یگوں میں مختلف ناموں سے آباد رہا ہے۔ ست یگ میں بان، ترتیا میں عہد گری، دواپر میں پنگل اور کلجگ میں سنبھل کے نام سے اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں سنبھل کو راجدھانی کا فخر حاصل ہوا۔ مسلم سلاطین کے عہد حکومت میں بھی اس کی یہی حیثیت برقرار رہی۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق اکبر کے عہد میں سرکار سنبھل کی تقسیم چالیس پرگنوں پر تھی جس کا رقبہ ۴۰۹۰۹۹۳ بیگھ اور ۲ بسواں تھا۔ احسن التواریخ (تاریخ سنبھل) کے مصنف غلام احمد شوق فریدی سنبھل کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ قدیم شہر جو آج قدیمی شان و شوکت عظمت و جلالت کے مٹنے پر بھی اپنے قدیمی آثار اور شکستہ دریچہ در و دیوار سے باوجود متواتر انقلابات دہر اور ادوار کے ہر قسم کے ارباب فن و کمال کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اب بھی اس کے چمن خزاں رسیدہ نے اپنی لطافت فانی

سے وہ گل کھلائے ہیں اور اس کے نونہال اپنی شاخ و برگ سے وہ ثمر نفیس و لطیف علم و عمل کے عالم ظہور میں لائے ہیں، جس سے ہندوستان چمک رہا ہے اور ہر صاحب ذوق اس کے خوش ذائقہ چاشنی فضل و ہنر سے مزہ چکھ رہا ہے۔"

برطانوی عہد حکومت میں سنبھل کا زوال شروع ہوگیا۔ عظمت پارینہ گھٹنے لگی۔ علوم و فنون کو زمانے کی نظر کھاگئی۔ بہ قول شوق فریدی۔

"خدا کی شان ہے آج وہی عظیم الشان شہر جو اقطاع حکومت ہند میں ایک زبردست دار السلطنت و راجدھانی ہونے کا فخر حاصل کئے۔ یہ اعتبار قدامت و شوکت تمام ہندوستان کا مایہ ناز تھا اور بعد میں ہندی راجاؤں کے حکومت کے خاتمے پر مسلم سلاطین کے دور حکومت و فرمان روائی میں ایک معزز خطاب و لقب سرکار سے پکارا جاتا تھا اور کبھی لفظ حویلی ہونے کا فخر اس کو حاصل تھا لیکن وہ اپنے منصب قدیمی اور پایہ اصلی و ذاتی سے گرتے گرتے اور مٹتے مٹتے بھی دور حکومت برطانیہ میں پرگنہ کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔"

سنبھل تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی حیثیت سے بھی اہم ترین مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دور دراز کے تشنگان علم یہاں آتے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ دسویں صدی ہجری میں ایک ایسا مدرسہ بھی قائم ہوا تھا جو اس زمانے میں مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ اس مدرسہ میں جیّد عالموں و بزرگوں نے علم و آگاہی کی وہ شمع روشن کی جس کا اجالا دور دور تک پھیلا اور صدیوں تک سرچشمہ علوم و فنون بنا رہا۔ خلاصہ ایوان مقفّل کے مولف رقم طراز ہیں:۔

"حاتم سرائے میں بہ عہد سلاطین ہمایوں، شیر شاہ، جلال الدین اکبر، جہاں گیر صاحبقران ایک عظیم الشان دار العلوم تھا جس میں دور دراز کے طلبہ علوم و فنون حاصل کرنے آتے۔ یہ مدرسہ کئی صدیوں تک سرچشمہ علوم و فنون بنا رہا۔"

حاتم سرائے میں قائم اس مدرسے نے سنبھل کو علم و دانش کے اہم ترین مرکز کی حیثیت سے عالم اسلام کو روشناس کرایا اور دور دراز سے تشنگان علم یہاں آکر اپنی پیاس بجھانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ یہ اسی مدرسہ کا فیض تھا کہ یہاں درس دینے والے عالم اور علوم و فنون کا درس حاصل کرنے والے طالب علم وحید عصر دیکتائے زمن کہلائے اور سنبھل کو وجہ امتیاز حاصل ہوا۔

بہ قول ڈاکٹر صابر حسین صابر سنبھلی

"چنانچہ مشہور زمانہ عالم و فقیہ مولانا شاہ محمد حاتم اسرائیلی جن کو ان کے علم و فضل کے سبب 'ابو حنیفہ ہند' تک کہا گیا 'منتخب التواریخ' کے مصنف ملا عبد القادر بدایونی جیسے مقتدر عالم نے بھی جن کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی، اور مولوی محمد حسن سنبھلی مرحوم جنھوں نے مطبع نول کشور سے وابستہ ہو کر درس نظامی میں پڑھائی جانے والی عربی درسیات کے سلسلے میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ آج تک طلبا اور فضلا ان کی کاوشوں سے استفادہ کرتے رہے ہیں، اسی سرزمین کے سپوت تھے۔" ؎۲

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اہم ترین مرکز علم و ادب ہونے اور ان گنت اکابر علما کی مایہ ناز خدمات کے باوجود نہ تو سنبھل کی کوئی مستند تاریخ لکھی گئی اور نہ ادیبوں و شاعروں کا کوئی معتبر تذکرہ مرتب ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالموں و تخلیق کاروں کی حیات و خدمات بھی پردۂ گمنامی میں جا پڑیں اور ادبی و علمی کارنامے بھی۔ غلام احمد شوق فریدی کے الفاظ میں:-

"افسوس تو یہ ہے کہ ایسے زبردست تاریخ ساز شہر کی تاریخ

جس کی سرزمین کے اندر قرن در قرن اہلِ علم و ہنر اور صاحبان فضل و کمال محو استراحت ہیں۔ ان کے قابل ذکر کارنامے اور عبرت آموز اولوالعزمی اور عالی ہمتی ہوتے اور قوم کی بیداری اور بیدار مغزی کا عمدہ خضر راہ بنتے، ایسے گم اور ازیاد رفتہ ہو سکتے کہ آنکھ و کان مشتاقان سیر و تفریح کے اس سے آشنا ہی نہ ہو سکیں۔"

قدیم تذکروں، کتابوں اور گلدستوں کی ورق گردانی سے یہ خوش گوار حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں ہر عہد اور ہر زمانے میں علم و آگہی کا چراغ روشن رہا ہے، اس مردم خیز خطے میں علم و فن اور شعر و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی گئی ہیں۔ ماضی میں یہاں ان گنت کاملان فن، اساتذہ سخن اور عاشقان ادب ہوئے جن کے فیض کا دریا جاری و ساری رہا۔ سولھوی صدی عیسوی میں شیخ محمد حاتم، شیخ عزیز اللہ تلنبی، شیخ عجائب، شیخ عثمان بنگالی، شیخ حمید الدین مفر، شیخ محمد کنبو، شیخ حلیم جیسے یگانہ روزگار اور ماہر فن اکابر ہوتے جنھوں نے علوم و فنون کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان جلیل القدر عالموں کا فیض بعد میں بھی جاری رہا اور ہر عہد میں ایسے باکمال علما و فضلا عالم وجود میں آتے رہے جن کا لوہا ایک عالم نے تسلیم کیا ہے۔

دستیاب شواہد کی رو سے شعر و ادب کا باقاعدہ سلسلہ یہاں اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہوا اور ہری ہر پرشاد شاد مصنف بدائع الفنون (۱۷۳۳)، شیخ علی بخش بیمار، احمد علی حسرت، سید حسین ذاکر مولف تذکرہ حسینی، سید قادر بخش قادر، قاضی عبد الفتاح قاضی، حکیم کبیر علی کبیر، حکیم صغیر علی مروت، محمد صبیح عالم خاں نیاز، محمد ہادی ہادی وغیرہم کے نام سنبھل کے اولین عہد کے شعرا میں آتے ہیں اور جن کا ذکر اردو کے قدیم تذکروں میں ملتا ہے۔ بعد کے شعرا کی خاصی بڑی تعداد بے اعتنائی و گم نامی کا شکار رہی۔ انیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں اور بیسویں صدی عیسوی

کی ابتدائی دہائیوں میں عروسِ سخن کے گیسو سنوارنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ ان میں بعض اساتذہ کی حیثیت سے معروف بھی تھے۔ بعض تلامذہ کی قابل لحاظ تعداد کی وجہ سے استادی و مشاقی کا لوہا منوا چکے تھے، بعض گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر کشتِ فن کی آبیاری کر رہے تھے بعض زمانے کے تقاضوں سے آشنا تھے اور شہرت و ناموری کی منزلیں طے کر چکے تھے لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتے گئے۔ ان میں سے بہت سے فن کار ایسے ہیں جن کے کوائف سے اہل علم بھی لاعلم ہیں۔

منشی امام الدین انصاری ہادیؔ، منشی حمید الدین انصاری بیخودؔ، رام جی مل رامؔ، مہابیر پرشاد شادؔ، سید حسین مہدی زیدی جادو رقمؔ، منشی محمد شاہ موجزؔ، مفتی عبد السلام سلامؔ، بہار حسین بہارؔ، مولوی ذکاوت حسین ذکاؔ، مولوی خادم علی، منشی سید محمد علی شوخؔ، احمد حسن بلیغؔ، غلام احمد شوق فریدیؔ، آل حسن حسنؔ، مولوی عابد حسین خلشؔ، محمود الحسن محمود اسرائیلی، منشی ظہور الدین انصاری عیشؔ، سوتی شیو پرشاد شادؔ، فضل رب باغؔ، سید محمد علی ہمدمؔ، حافظ احمد اللہ عاجزؔ، منشی میاں خان تفکرؔ، حافظ مسیت اللہ محزوںؔ، محمد یٰسین جلاؔ، محفوظ علی خاں محفوظؔ، منور حسین منورؔ، محمد ظفر ظفرؔ، عبد الغفور غفورؔ، محمد حسین شاعرؔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے شعرا کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

بیسویں صدی میں پیدا ہونے اور راہی ملک عدم ہو جانے والے شعرا میں ناظم عزیزی، شہاب الدین شہاب، رشید اللہ خاں رشیدؔ، فضل علی عابدی، حکیم ثاقب اللہ ثاقبؔ، الٰہی بخش قیصرؔ، مظہر حسین مظہرؔ، سید محمد ظفر اشکؔ، آل حسن طورؔ، شفقت حسین بزمیؔ، محمد یعقوب واقفؔ، ڈاکٹر مقصود حسین تمکین سرمدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی کے اوائل میں احسن اللہ احسنؔ،

احمد خاں احمد ، رشید علی آہ ، محمد ایوب خاں ایوب ، احمد زماں خاں احمد ، احمد حسنی احسن ، ایوب حسن اسرائیلی ایوب ، عبدالاحد وارثی احد ، بدرالسلام بدر ، عبدالقیوم ترنم ، عبدالغفار بے تاب ، موہن سرن داس بے خود ، عبدالمجید پیارے ، تجمل حسین تجمل ، عبدالمالک جنوں ، جمیل احمد جمیل ، سراج احمد چراغ ، سید حامد حسین حامد ، حکیم سید ابرار حسین حکیم ، خورشید حسن خورشید ، خورشید علی خاں خورشید ، منشی محمد داؤد خاں داؤد ، ذاکر حسین ذاکر ، ریاض الدین حسن ریاض ، عبدالمجید شعلہ ، عبدالشکور شکور ، شیدا اسرائیلی ، محمد شفیع خاں شفیع ، لائق علی شمیم ، شوکت علی شوکت ، منشی محمد اسماعیل صوفی ، ضمیر احمد ضمیر ، مشتاق حسین عرشی ، حکیم عبدالعزیز عزیز ، منشی قادر بخش عاصی ، جمیل احمد قیصر ، کرم الٰہی کرم ، عبدالرزاق مرزا ، معین الدین انصاری معین ، فضل حق محشر ، مقصود علی خاں مقصود ، مقبول الٰہی مقبول ، محمد کبیر الدین ، نور الٰہی نور ، مظہر حسین نوا ، پی ایل سنگھ وفا ، عقیل احمد وفا ، محمد یوسف یوسف ، محمد یونس علی خاں یونس کا کلام بیسوی صدی کی دوسری تیسری دہائی کے رسالوں وگلدستوں میں ملتا ہے ۔ ان میں چند شعرا کی شاعری مختصر مدت تک محدود رہی ۔ کچھ برائے نام شاعر تھے لیکن بعض شعرا کا کلام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سنبھل کے قدیم ترین ، قدیم اور ماضی قریب کے اہم شعرا پر راقم الحروف کے سلسلہ ہائے مضامین مقتدر رسائل وجرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں ۔ " سنبھل کا علمی و ادبی پس منظر " " قدیم ترین شعرائے سنبھل "۔ " سنبھل کے قدیم اردو شعرا " کے عنوان سے پچاس سے زائد مضامین کی اشاعت اور " چند ممتاز شعرائے سنبھل جلد اول " کے منظر عام پر آنے کے بعد بھی یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ سنبھل کے اردو ادبیات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا ہے اور یہاں کے شاعروں ادیبوں اور عالموں کی حیات وخدمات کو اجاگر کرنا اہم ادبی فریضہ ہے ۔ راقم الحروف کی تنگ دوو

جاری ہے اور تلاش و جستجو کے نتیجے میں جو کچھ ہاتھ آتا ہے اسے منظر عام پر لانے اور ادبی دنیا سے متعارف کرانے کی سعی کی جارہی ہے۔ چنانچہ سنبھل کے "قدیم اخبارات و رسائل" "سنبھل کے اکابر علما و شعرا" "سنبھل کے مجاہدین آزادی" موضوعات پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کی جسارت کی جاتی رہی ہے۔ "قدیم شعرائے سنبھل" کے سلسلے کی کتاب "سنبھل کے چند ممتاز شعرا" کی جلد دوم اور سوم ترتیب کے آخری مراحل میں ہے۔ ان کے علاوہ تذکرہ شعرائے سنبھل جلد اول (انیسویں صدی عیسوی تک) اور جلد دوم (بیسویں صدی عیسوی) زیر ترتیب ہے۔ اکابر علما کے کوائف و دیگر تفصیلات کی تلاش جاری ہے جیسے جیسے مواد فراہم ہوتا جارہا ہے، علما پر مضامین لکھ کر شائع کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ پیش نظر کتاب میں وہ چند مضامین شریک اشاعت کیے گئے ہیں، جو اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ علم و دانش اور شعر و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دینے والا تاریخ ساز قصبہ سنبھل جہاد آزادی کی تاریخ میں بھی مرکزی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ مادر وطن کو غلامی کے شکنجے سے نجات دلانے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھنے والوں کی یہاں کمی نہیں رہی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی میں یہاں کے جیالوں نے نہ صرف تن من دھن کی قربانیاں دیں بلکہ اگلی منازل طے کرنے میں بھی پیچھے نہ رہے۔ آزادی کی خاطر پیش پیش رہنے والے مجاہدین کی ایک طویل فہرست ہے، جنھوں نے ملک و قوم کی آن کی خاطر عظیم الشان کارنامے انجام دیئے۔ یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ بیشتر مجاہدین آزادی کی حیات و کارنامے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ جو نام ہمارے لیے مشعل راہ ہو سکتے تھے آج ہم ان سے واقف بھی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو یہ احساس دلایا جائے کہ جب انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں اور پر فریب سیاست سے ہندوستان کو غلامی کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا اور ہندوستانیوں پر جور و ستم کی انتہا کر دی تو سارے ملک میں اضطراب

دبے چینی کی لہر دوڑ گئی اور مادر وطن کے سپوتوں میں احساس آزادی بیدار ہونے لگا وہ چنگاری جو کہیں دبی پڑی تھی ۱۸۵۷ء میں پوری طرح بھڑک اٹھی اور سارے ملک کی طرح سنبھل میں بھی جذبہ حب قومی پوری شدت سے ابھرا حرّیت پسند محب وطن باشندوں نے غلامی کے خلاف سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں آنے کی جرأت کی۔ چنانچہ جب شہزادہ فیروز بخت سنبھل آیا تو یہاں کے شہریوں نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا اور اس کے ہمراہ مرادآباد جاکر انگریزی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا جس کی پاداش میں یہاں کے سرفروشوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔ منشی امام الدین انصاری کو پھانسی دینے کے بعد ان کی نعش چونے کی بھٹی میں جلادی گئی۔ مولانا غلام رسول اور ان کے رفقانے جام شہادت نوش کیا۔ انگریزوں نے سنبھل کے مجاہدین آزادی پر ظلم وستم کی انتہا کردی لیکن ان کے پائے استقامت کو جنبش نہ ہوئی۔ وطن عزیز کی خاطر جان دینے کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ بلکہ ہر سزا کے بعد 'ذوق گنہ' بڑھتا ہی رہا۔ منشی امام الدین انصاری نے جام شہادت نوش کرکے جو شمع روشن کی اس کے پروانوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ منشی امام الدین انصاری کے حقیقی پوتے منشی معین الدین انصاری کے علاوہ چودھری ریاست علی خاں، لالہ چندو لعل، باسدیو مولانا محمد اسماعیل، لالہ چیتن سروپ، مولانا مبارک حسین محمودی، قاری عبدالحق، مولوی عبدالوحید، مولوی سلطان احمد، حافظ نورالحسن اور مولانا عبدالقیوم وغیرہم نے نہ صرف اپنے اسلاف کی پیروی کی بلکہ مادر وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں سب کچھ لٹا دینے والے سرفروشان وطن سے کسی طرح پیچھے نہ رہے اور وہ شمع حریت جو ۱۸۵۷ء میں روشن ہوئی تھی، وقت کے طوفانوں کا سامنا کرتے ہوئے پوری آب وتاب کے ساتھ فروزاں رہی۔

راقم السطور نے سنبھل کے اکابر علما وشعرا کے ساتھ ساتھ مجاہدین آزادی کی حیات وکارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش جاری رکھی ہے جن سرفروشان وطن کے کوائف ان کے اعزا سے دستیاب ہوسکے یا انھوں نے

خود لکھ کر عنایت فرمائے ان کا تعارف شائع کیا جاتا رہا ہے۔ چودھری ریاست علی خاں، مولانا محمد اسماعیل، مولانا مبارک حسین محمودی، قاری عبدالحق، مولوی سلطان احمد، حافظ نورالحسن اور مولانا عبدالقیوم کی حیات و مجاہدانہ سرگرمیوں پر جو تعارفی مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے انھیں کو شریک اشاعت کیا گیا ہے دیگر مجاہدین کے کوائف کی تلاش جاری ہے جو انشاء اللہ آئندہ پیش کئے جائیں گے۔

(۲)

امراء و روسا نے علم و ادب کی کتنی سرپرستی کی اور اردو دنیا پر کتنے احسانات کئے اس کی روداد تاریخ کا حصہ بن چکی ہے آج کا تجربہ تو یہ ہے کہ علم اور دولت کا ہمیشہ سے بیر رہا ہے۔ یہ حقیقت اب افسانہ بن گئی ہے کہ دولت نے ہمیشہ علم کی چوکھٹ پر دستک دی ہے آج صورت حال تقریباً برعکس ہے۔ حکومت کی نگاہ میں بھی سازندے اور گویئے، شاعر و ادیب سے بہتر ہیں، اور سماج کی نظروں میں بھی اس کا درجہ کم تر ہی ہے۔ دولت مند تو بس دولت و اقتدار کے پجاری ہیں۔ باقی باتیں دکھاوٹی ہیں۔ اور سنبھل تو بقول ڈاکٹر صابر سنبھلی علم و ادب کا گہوارہ ابھی یہ نہیں رہا کہ یہاں کبھی کسی دریا دل یا فیاض ہستی نے علم و ادب کی سرپرستی نہیں کی۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت "عاشق پبلک لائبریری" ہے۔ جس کی تعمیر نو، توسیع اور ترقی میں یہاں کے دولت مندوں نے عشر عشیر بھی حصہ لینے کا گناہ نہیں کیا۔ (کسی نیتایا ابھی نیتا، ضلع مجسٹریٹ یا کوتوال کا اشارہ ہوتا تو کچھ بچھ جاتے۔) ایسے نامساعد حالات اور عبرت خیز ماحول کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں "الحاج محمد عبداللہ" کی صورت میں ایسی ہستی رحمت بن کر سامنے آئی کہ اچھے اچھے انگشت بدنداں رہ گئے۔ جنم بھومی کی محبت کے جذبے سے سرشار، علم و ادب کی خدمت کے احساس سے معمور، غریبوں و بے سہاروں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار، الحاج محمد عبداللہ نے علم اور دولت کے بیر کے نظریے کو غلط ثابت کر دکھایا۔ انھوں نے اپنے رفقا، اعزا اور ہم پیشہ حضرات

کھاشق پبلک لائبریری کی ترقی و توسیع کے لیے ہر ممکن تعاون دینے کی ترغیب دی اور انھیں یہ احساس دلایا کہ علمی خزینوں کی ترقی و بقا ہر شہری کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے ادارہ کی ہمہ گیر و ہمہ جہت ترقی و توسیع کے لیے علم دوست شہریوں سے عطیات فراہم کرائے سو ان گرانقدر عطیات کے علاوہ موصوف سنبھل میں ایک اسکول کے قیام کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ موصوف کی مساعی جمیلہ قابل فخر و قابل ذکر ہی نہیں، اہل ثروت کے لیے تازیانہ عبرت بھی ہیں۔

الحاج محمد عبداللہ صاحب کی دیرینہ خواہش ہے کہ سنبھل کی تاریخ از سر نو لکھی جائے۔ راقم السطور کی تاریخ سے دلچسپی نہیں۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ پیش نظر کتاب "سنبھل کے چند اکابر علما و مجاہدین آزادی" بھی انھیں کی خواہش کی تکمیل کا نتیجہ ہے اور موصوف کے تعاون سے منظر عام پر آرہی ہے

سنبھل اور ادبیات سنبھل سے متعلق مضامین لکھنے کی ترغیب میں ہماری زبان دہلی روزنامہ قومی آواز اور ماہنامہ نیا دور لکھنؤ نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ بالخصوص قومی آواز نے اپنے ہفت روزہ ضمیمہ میں قسط وار مضامین نمایاں طور پر شائع کرکے بڑی حوصلہ افزائی کی ہے شعرائے سنبھل سے متعلق مواد کی فراہمی و نشاندہی میں جناب معجز حسین معجز، الحاج اعجاز وارثی صاحب، ڈاکٹر صابر حسین صابر سنبھلی، ڈاکٹر تنزیل احمد، جناب این۔ رحمان سنبھلی (لطیف الرحمان)، جلال الدین افسر، اقبال قاسم کیفی، عبدالودود خاں وغیرہم نے غیر معمولی مدد فرمائی ہے۔ اکابر علما کے سلسلے میں شہید آزادی منشی امام الدین انصاری مرحوم کے خاندان کے روشن چراغ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور قاری حمید الدین مرحوم کے فرزند اکبر مولانا محمد برہان الدین استاد ندوۃ العلما لکھنؤ نے بڑی زحمتیں اٹھا کر مواد فراہم کیا اور گرامی ناموں کے ذریعہ بصیرت افروز رہنمائی و سرپرستی فرماتے رہے ہیں۔ شمس العلما مولوی خلیل احمد اسرائیلی

کی فہم و فراست کے امین اور مولوی حبیب احمد اسرائیلی کے فرزند اسعد اسرائیلی صاحب نے قدیم ترین علما سے متعلق عربی متن کا ترجمہ کر کے ممنون کرم کیا۔
اس ضمن میں محترم حکیم ظل الرحمان سنبھلی (دہلی) کا ذکر ضروری ہے جو اپنے شہر سے محض رسمی محبت ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کی نیک نامی کے لئے صدق دل سے کوشاں رہتے ہیں موصوف نے سنبھل کی مقتدر شخصیتوں اور تاریخ پر گرانقدر مضامین لکھے ہیں اور راقم السطور کو بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔
موصوف نے بھی سنبھل کی تاریخ اور سنبھل کی ممتاز شخصیتوں سے متعلق مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں خلوص نیت سے کوشش کی انھوں نے شہر کے ایک مبلغ دین کو خطوط بھی لکھے اور راقم السطور کو بھی موصوف سے رجوع کرنے کی تلقین کی لیکن ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔
یہاں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ سنبھل اور ادبیات سنبھل سے متعلق راقم السطور کی تحریروں کی اشاعت سے وہ مقصد تو حاصل نہ ہو سکا، جس کے لئے ان کی اشاعت کرائی گئی تھی یعنی ان تحریروں کی حیثیت خام مواد کی ہے اور بہت سے پہلو تشنہ ہیں، سنبھل اور ادبیات سنبھل سے دلچسپی رکھنے والے قلم کار و محققین ادب بالخصوص سنبھل کے اہل قلم ان موضوعات پر قلم اٹھائیں اور یہاں کے فن کاروں کو ان کا صحیح مقام دلانے کی جد و جہد کریں۔ مگر چند شخصیتوں کے سوا کسی نے اس طرف توجہ نہ دی اور بے اعتنائی کا وہ رویہ جاری رہا جس کے باعث بہت سے اہم فن کار پردۂ خفا میں رہ گئے البتہ راقم السطور کے کرم فرماؤں نے، جو اردو ادب میں اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں، نہ صرف سرپرستی و حوصلہ افزائی کی بلکہ خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے خلوص اور اپنائیت کا ثبوت دیا ہے۔
ان میں اہم ترین نام بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر حنیف نقوی صاحب کا ہے جن کے گرامی نامے میرے لئے مشعل ہدایت بھی ہیں اور بیش قیمت سرمایہ بھی۔ موصوف کے علاوہ پروفیسر عتیق احمد صدیقی صاحب مسلم یونیورسٹی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب دہلی یونیورسٹی،

پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب دہلی یونیورسٹی، پروفیسر ایم۔ایم۔جلالی صاحب روہیل کھنڈ یونیورسٹی، ڈاکٹر خلیق انجم صاحب (دہلی) ڈاکٹر اختر بستوی صاحب (گورکھپور یونیورسٹی) کی کرم فرمائیاں و ذرہ نوازیاں بے حد و بے حساب ہیں۔

ان تمام محسنوں و کرم فرماؤں کا جن کا ذکر اس تحریر میں کیا گیا اور سبھی معاونین و مہربانوں کا جن کا ذکر نہیں کیا جا سکا، شکریہ ادا کرنے کی تاب و مجال راقم السطور میں نہیں ہے۔ دراصل ان کے احسانات و عنایات کا شکریہ ادا کرنا محض رسمی بات ہوگی، ان کی سرپرستیاں و نوازشیں شکریے سے بے نیاز ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب میں شامل مضامین کی حیثیت بھی نقش اول کی ہے۔ امید ہے اسی نقطہ نظر سے پڑھے جائیں گے۔

(۳)

یہاں اس خوشگوار حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ سنبھل عصر حاضر میں بھی گراں مایہ علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہاں کے مشہور و ممتاز ادبا و شعرا کا ذکر یہاں مقصود نہیں ان چند علما کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو آج اس شہر کے لیے باعث افتخار ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا ہے جو عالم اسلام میں اپنے وطن کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرات مولانا برہان الدین، مولانا عارف سنبھلی، مولانا عبد المقتدر، مولانا عتیق الرحمان نعمانی، مولانا محفوظ سنبھلی، مولانا سجاد نعمانی، عبد الستار سلام قاسمی وغیرہ ہم علم و دانش کی گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جواں سال قلم کاروں میں مولانا عبد المعبد سنبھلی، مولانا عمران ذاکر سے بہتر توقعات وابستہ ہیں۔

سنبھل کے اکابر علمائے قدیم میں جو عالم اس مجموعہ میں شامل نہیں کیے جا سکے اور ان کے عصر حاضر کے علما کے حالات و کوائف انشاءاللہ مستقبل میں پیش کیے جائیں گے۔

——— سعادت علی صدیقی

ص ۲، ۳ پیش لفظ چند ممتاز شعرائے سنبھل مطبوعہ ۸۴

علمائے اکابر

شیخ محمد حاتم اسرائیلی رح
شیخ عزیز اللہ تلنبی رح
شیخ عجائب سنبھلی رح
سید محمد المکی رح
شیخ حمید الدین مفسّر
شیخ عثمان بنگالی
شیخ عبد الحلیم اسرائیلی
شیخ محمد کنبو رح
شیخ اخوند پنجو بابا
قاضی محمد معظم
قاضی حمید الدین

نوٹ:- مواد کی فراہمی اور کتابت شدہ اوراق میں ترمیم نہ ہو سکنے کے باعث علمائے اکابر کی ترتیب قائم نہیں رہ سکی ہے۔

شیخ محمد حاتم سنبھلی

شیخ محمد حاتم اسرائیلی اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے، والد کا نام ابی حاتم حنفی تھا، جن کا سلسلۂ نسب پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کے نامور صحابی و عالم حضرت عبداللہ بن سلام سے جا ملتا ہے۔ شیخ حاتم، جامع کمالات تھے ان کے فضل و کمال کے باعث ہی انھیں ابوحنیفہ ہند، تک کہا گیا۔ سنبھل کے قدیم محلہ حاتم سرائے انھیں کے نام پر آباد ہے۔ شیخ حاتم مشہور فلسفی و عالم عزیز اللہ تلبنی کے شاگرد تھے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی رقم طراز ہیں:-

"میاں حاتم سنبھلی شیخ عزیز اللہ تلبنی کے شاگرد و مرید تھے۔ اپنے زمانے میں جامع حیثیت کے مالک تھے۔ خاص طور سے علم کلام، اصول اور عربی ادب میں بے نظیر تھے۔ صاحب ریاضت، متقی اور پرہیزگار تھے۔ کہتے ہیں کہ شرح مفتاح و مطول کو بسم اللہ کی 'ب' سے تمت 'ت' تک (از اول تا آخر) چالیس مرتبہ پڑھایا۔ اسی طرح دوسری کتابوں کو قیاس کرنا چاہیئے۔ جب ملا علاء الدین لاری نے حاشیہ عقائد نسفی کو بڑے دعوے کے ساتھ میاں صاحب کے سامنے پیش کیا تو میاں صاحب نے اس کے مطالعہ کے بعد ایسی باریکیاں بیان فرمائیں کہ ملا علاء الدین کو جواب نہ بن پڑا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ستر سال تک مسند ارشاد و افادہ پر متمکن رہے۔ ۹۶۸ھ مطابق ۶۱-۱۵۶۰ء میں انتقال ہوا۔"

ملا عبد القادر بدایونی میاں حاتم سنبھلی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے میاں صاحب کے حالات تفصیل سے منتخب التواریخ میں لکھے ہیں[۳۵]

مولف تذکرہ علمائے ہند کے مطابق شیخ حاتم کا انتقال ستر سال کی عمر میں ۶۱-۱۵۶۰ء میں ہوا۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش پندرھویں صدی عیسوی کی آخری دہائی یعنی آج سے تقریباً پانچ سو سال قبل ہوئی۔

ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں شیخ حاتم کا ذکر تفصیل سے کیا ہے:

" دانش مند متبحر بوده و عمر ہا بر مسند افادت درس علوم فرموده۔ صاحب کمالات صوری و معنوی است در عین تحصیل علم حال بر و غالب آمده و ترک قیل و قال کرده اراده بر استاد خود شیخ عزیز اللہ دانش مند طلبنی کہ از علما باللہ و مشائخ مقتدائی روزگار است، آورده و سیر و سلوک در حضرت شیخ علاء الدین چشتی دہلوی نیز قدس اللہ روحہ نموده و اجازت تکمیل طالبان و مریدان از ہر دو بزرگوار یافت و در اوایل جذبہ ده سال در صحرای نوامی سنبل و امروہہ سر و پا برہنہ می گشت و دریں مدت سر او بہ بالیں و بستر نرسیده۔ صاحب ذوق و سماع بود پیوستہ در وقت تکلم و تبسم اللہ بر زبانش می گزشت و در نہایت احوال کیفیت محبت بر و بمرتبہ استیلا یافت کہ با ترک نغمہ از خود می رفت طاقت شنیدن سرود نداشت۔ فقیر چوں در سنہ ۹۶۰ھ نہصد شصت بسن دوازده سالگی در صحبت والد ماجد بہ ملازمت شیخ در سنبل رسید قصیده برده را در خانقاه ایشاں یاد گرفتہ اجازت حاصل کرد و از کتاب کنز فقہ حنفی نیز سباقی چند تیمنا و تبرکا خوانده و در سلک ارادت خاص آورد و بوالد فقیر فرموده کہ ما پسر شما را از جانب استادی میاں شیخ عزیز اللہ کلاه و شجره بداں جہت داده ایم کہ از علم ظاہری ہم بہره یابد و الحمد للہ علی ذالک حضرت شیخ در سنہ نہصد شصت و نہ ۹۶۹ھ بجوار قرب ایزدی واصل شد" درویش

دانش مند" تاریخ اوست ۔ طیب اللہ ثراہ واز اتفاقات آنکہ والد فقیر نیز درہمیں تاریخ برحمت حق پیوست گویا نسبت ارادت مقتضی ایں بود" ۴۷؎

شیخ حاتم کے سنِ وفات میں ملا عبد القادر بدایونی اور مولوی رحمان علی نے ایک سال کا فرق بتایا ہے لیکن خود بدایونی نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۹۶۸ھ میں ہوا۔ صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبد الحیؒ نے لکھا ہے :-

"ممتاز عالم شیخ حاتم ابن ابی حاتم حنفی سنبھلی۔ ہندوستان کے ایک مشہور عالم تھے۔ بعض علما سے چھوٹی کتابیں پڑھنے کے بعد شیخ عزیز اللہ تلنبی سے وابستہ ہوئے اور منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کی ساری کتابیں ان سے پڑھیں۔ ان ہی سے بیعت کی۔ بعد میں شیخ علاء الدین دہلوی سے استفادہ کیا۔ شہر سنبھل میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور ۴۰ برس تک سنبھل کو فیض پہنچایا۔

وہ ایک بڑے عالم تھے۔ بہت لوگوں نے ان سے پڑھا اور فائدہ اٹھایا۔ بہت عبادت گزار اور دیانت دار شخص تھے۔ اُن سے سید محمد امروہوی، شیخ عبد القادر بدایونی، شیخ ابو الفتح فرید آبادی، شیخ عثمان بنگالی اور بہت سے دیگر علما نے استفادہ کیا۔

۹۶۹ھ میں سنبھل میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ عبد القادر بدایونی نے ان کی تاریخ وفات "درویش دانش مند" نکالی ہے اور اپنی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب میں ایک اور جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۹۶۸ھ میں ہوا اور ان کی تاریخ وفات آیتِ قرآنی "عند ملیک مقتدر" سے نکالی ہے۔ واللہ علم" ۴۸؎

"نزہۃ الخواطر" مصنفہ مولانا عبد الحیٔ بن فخر الدین الحسنی کے تعارف کا متن درج ذیل ہے :-

الشیخ العالم الکبیر حاتم بن ابی حاتم الحنفی السنبھلی، أحد العلماء المشہورین فی الھند، قرأ المختصرات علی بعض العلماء، ثم لازم الشیخ عزیز اللہ التلنبی وقرأ علیہ سائر الکتب الدرسیة من المعقول والمنقول وأخذ عنہ الطریقة، ثم أخذ عن الشیخ علاء الدین الدھلوی، وتصدر التدریس ببلدة سنبھل، فدرس وأفاد بھا أربعین سنة،

وکان فاضلاً کبیراً کثیر الدرس والافادة، شدید التعبد متین الدیانة، أخذ عنہ السید محمد الأمروھوی والشیخ عبد القادر البدایونی والشیخ ابو الفتح الخیر آبادی والشیخ عثمان البنگالی وخلق کثیر من العلماء۔

مات سنة تسع وستین وتسعمائة بمدینة سنبھل فدفن بھا، وأرخ مولانا عبد القادر المذکور من درویش دانشمند، ذکرہ فی تاریخہ المنتخب، وقال فی موضع آخر فی ذلک الکتاب: إنہ توفی سنة ثمان وستین وتسعمائة، وأرخ لوفاتہ من قولہ تعالی "عند ملیک مقتدر" واللہ اعلم۔ ؎۶

حواشی:۔

؎۲ پیش لفظ ممتاز شعرائے سنبھل مطبوعہ ۱۹۸۴ء، ص ۱۱

؎۳ تذکرہ علمائے ہند مولفہ رحمان علی مرتبہ ومترجمہ محمد ایوب قادری مطبوعہ ۱۹۶۱ء ص ۱۵۶

؎۴ منتخب التواریخ جلد سوم از عبد القادر بن ملوک شاہ ۱۸۶۹ء ص ۳-۲

؎۵: نزہت الخواطر جلد چہارم مولوی عبد الحیٔ بن فخر الدین الحسنی ۱۹۷۳ء، ص ۸۳

؎۶ ایضاً

شیخ عزیز اللہ تلنبیؒ

شیخ عزیز اللہ تلنبی عہد سکندری میں ملتان سے سنبھل آئے تھے ان کا شمار ممتاز اکابر میں ہوتا ہے۔ بندگی میاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ قدیم محلہ میاں سرائے انھیں کے نام پر آباد ہوا۔ ان کا انتقال بھی سنبھل میں ہوا۔ محلہ میاں سرائے میں مشہور طبیب حکیم رئیس احمد صاحب کی قیام گاہ کے نزدیک واقع مسجد کے ایک گوشہ میں محو خواب ہیں۔ مناظر احسن گیلانی نے مشہور کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم" میں موصوف کا تذکرہ خاص اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔ صاحب تذکرہ علماء ہند رقم طراز ہیں۔

"شیخ عزیز اللہ تلنبی صاحب، صاحبِ ارشاد و ہدایت اور دانشمند فاضل تھے۔ سلطان سکندر لودی کے زمانے میں سنبھل میں سکونت اختیار کی۔ فیاض طبع اور خاطر ذہن تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہایت ذہین مدرس ہیں۔ ہر قسم کی مشکل کتابیں منتہی طلباء کو پڑھاتے تھے اور بغیر مطالعہ کے درس دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ لوگ امتحان کی غرض سے ایسے سوالات لاتے تھے کہ جن کے جوابات بہت مشکل ہوتے تھے۔ شیخ بغیر کسی وقت کے فوراً حل کر دیتے تھے۔ میاں حاتم سنبھلی ان کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ان کی عجیب و غریب تصانیف مشہور ہیں۔ ان میں سے رسالہ "عینیہ" ہے جو انھوں نے شیخ امان اللہ پانی پتی کے رسالہ غیریہ کے جواب میں لکھا ہے۔

۹۷۵ھ (۶۸-۱۵۶۷ء) میں انتقال ہوا۔ تلبنہ ملتان کے قریب ایک شہر ہے۔۔۔۔۔" صاحب "نزہت الخواطر" حضرت مولانا عبدالحی نے بھی اسی طرح کے کوائف تحریر فرمائے ہیں:۔

"شیخ فاضل عزیز اللہ حنفی تلبنی ملتانی ثم السنبھلی ایک باعمل عالم اور محقق امام تھے۔ سکندر شاہ لودی کے زمانے میں دہلی آئے پھر سنبھل چلے گئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کی اپنی ساری توجہ درس و تدریس پر مبذول کر دی بے حد ذہین باصلاحیت عبادت گزار اور تنہائی پسند آدمی تھے۔ اصول، کلام، منطق، فلسفہ اور تمام معقولات پر بڑی دسترس تھی۔ ادب و علوم میں اچھی نگاہ تھی۔ ان سے شیخ نظام الدین خیر آبادی شیخ حاتم ابن ابی حاتم سنبھلی اور بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا ہے۔ ۹۳۲ھ میں وفات ہوئی۔ جیسا کہ "اسرار یہ" میں ہے۔۔۔"

تذکرۂ "نزہۃ الخواطر" میں عزیز اللہ تلبنی کا سالِ وفات "ستر اثنتین وثلاثین وتسعمائۃ" درج کیا ہے۔ جب کہ تذکرہ علماء ہند میں سن وفات ۹۷۵ھ لکھا ہے۔ جس کی تصدیق صاحب منتخب التواریخ سے بھی ہوتی ہے۔ نزۃ الخواطر، کا متن یہ ہے:

"الشیخ الفاضل العلامۃ عزیز اللہ الحنفی التلنبی الملتانی ثم السنبھلی، کان من العلماء العاملین والائمۃ المحققین، قدم دھلی فی عھد سکندر شاہ اللودی، ثم دخل سنبھل وسکن بھا، وقصر ھمتہ علی الدرس والافادۃ، وکان مفرط الذکا، جید القریحۃ، شدید التعبد، قلیل الاختلاط بالناس مع التقوی المفرط والخمول الزائد، ولہ الید الطولی فی الاصول والکلام والمنطق والحکمۃ وسائر الفنون النظریۃ ومشارکۃ جیدۃ فی المعارف الادبیۃ، اخذ عنہ الشیخ نظام الدین الخیر آبادی والشیخ حاتم ابن ابی حاتم السنبھلی وخلق کثیر من العلماء، توفی سنۃ اثنتین وثلاثین وتسعمائۃ، کما فی الاسراریۃ"

نزۃ الخواطر، ــــــــ ص ۲۲۶

شیخ عجائب سنبھلی

شیخ فاضل عجائب بن اسحاق اسرائیلی سنبھلی ایک صوفی شخص تھے شیخ سماء الدین دہلوی سے استفادہ کیا۔ اور ایک طویل مدت تک ان سے وابستہ رہے۔ جب شیخ کا انتقال ہوگیا تو دہلی سے سنبھل چلے آئے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ علوم طریقت کے آشنا تھے اور شاعرانہ ذوق رکھتے تھے ۹۳۰ھ میں سنبھل میں انتقال ہوا۔ جیساکہ کتاب "بحر زخار" میں ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر ــــــ نے لکھا ہے:۔

"الشیخ الفاضل عجائب بن إسحاق الاسرائیلی السنبھلی' اجد د جال الطریقۃ' أخذعن الشیخ سماء الدین الدھلوی ولازمۃ ملازمۃ طویلۃ' ولمامات الشیخ انتقل من دھلی إلی سنبھل فسکن بھا' وکان عاملا بالمعارف الالٰھیۃ' شاعرفی الشعرابالطلالی توفی سنۃ ثلاثین وتسعماۃ سنبھل' کمافی بحر زخار"

سید محمد المکی سنبھلی

شیخ قاری محمد بن ابی محمد الحسینی المکی السنبھلی اپنے زمانہ کے ایک مشہور قاری (مجود) تھے۔ ساتوں قراء توں میں قرأت قرآنِ پاک کرتے تھے۔ عبدالقادر ابنِ ملوک شاہ بدایونی نے ان سے ۹۵۹ھ میں سنبھل میں ہی تحصیل علم کیا ہے اور اپنی تاریخ میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

"صاحب نزۃ الخواطر" نے السید محمد المکی السنبھلی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:---

الشیخ المجود محمد بن ابی محمد الحسینی المکی السنبھلی أحد القراء المشهورین فی عصرہ، کان یقرآن علیٰ سبع قراءات، قرأ علیه عبد القادر بن ملوک شاہ البدأیونی سنة تسع وخمسین وتسعمائة ببلدة سنبھل وذکرہ فی تاریخه۔

(ص ۳۳۰)

شیخ حمید الدّین مفسّر

شیخ حمید الدین مفسّر عہد ہمایوں کے ممتاز عالم تھے ہمایوں کو ان سے بے حد عقیدت تھی اور یہ ان کے مقرب تھے مگر علمار سلف کی شان کے ساتھ رہتے تھے۔ اگر کوئی بات نامناسب ہوتی تھی تو برملا ٹوک دیتے تھے۔ مصنف "تذکرہ علمائے ہند" نے انھیں علامہ زماں دیکتائے درواں لکھا ہے۔ قرآنِ پاک کی تفسیر اور اس کے اسرار درموز پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔

مشہور ہے کہ ہمایوں نے جب دوبارہ ہندوستان فتح کیا اور دارالسلطنت دہلی کی طرف عازم سفر ہوا تو شیخ حمید فرط مسرت سے اپنے محبوب بادشاہ کا استقبال کرتے ہوئے کابل بہ نفس نفیس گئے۔ انھیں پر خلوص تعلقات کی بنا پر ہمایوں ان کا بہت احترام کرتا تھا۔"

رحمان علی مؤلف تذکرہ علمائے ہند رقم طراز ہیں :۔

شیخ حمید سنبھلی قرآن کریم کی تفسیر میں علامہ زماں اور یکتائے دوراں کی حیثیت سے معروف ہوئے فرقان حمید کی نکتہ سنجی میں مشہور تھے۔ ہمایوں بادشاہ ان کا بڑا معتقد تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ برصغیر ہند و پاکستان کے دوبارہ فتح کرنے کے زمانے میں ہمایوں بادشاہ کے استقبال کی غرض سے کابل گئے۔ بادشاہ ان سے بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ ایک دن بادشاہ سے ناراض ہوگئے اور کہا اے بادشاہ! میں نے تمھارے سپاہیوں کے نام یار علی، کفش علی اور حیدر علی پائے اور کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ دوسرے یاران پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اس کا نام ہو۔ بادشاہ کو غصّہ آگیا اس ہاتھ میں جو قلم تھا اس کو زمین پر پھینک

دیا اور کہا کہ خود میرے دادا کا نام عمر شیخ ہے اور میں کچھ نہیں جانتا، یہ کہہ کر اٹھا اور حرم میں چلا گیا۔ پھر واپس آیا ملائمیت اور محبت سے شیخ کو اپنے حسن عقیدہ پر اطلاع دی۔ اس حکایت کا نتیجہ مذہب اہل سنت میں شیخ حمید کا متصب ہونا اور ہمایوں بادشاہ کا خوش خلقی و خوش عقیدگی ہے۔"

شیخ حمید الدین مفسرؒ سنبھلی کی وفات ۷ محرم ۹۸۳ھ مطابق ۱۵۷۴ء کو سنبھل میں ہوئی۔ ان کا تفصیلی ذکر تذکرہ "نزہتہ الخواطر" (صفحہ ۹۹) میں کیا گیا ہے۔

شیخ عثمان بنگالی

شیخ فاضل عثمان بن ابی عثمان حنفی بنگالی ثم السنبھلی اپنے زمانے کے ایک مشہور و ممتاز عالم تھے۔ سرزمین بنگال میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی۔ حصول علم کے لیے ترک وطن کیا اور شہر سنبھل پہنچے۔ وہاں شیخ حاتم سنبھلی سے کچھ تعلیم پائی پھر گجرات چلے گئے اور علما وجیہ الدین علوی گجراتی سے سند حاصل کرنے کے بعد سنبھل لوٹ آئے اور وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ کمال محمد سنبھلی نے "اسراریہ" میں ان کا ذکر کیا ہے بدایونی نے لکھا ہے کہ میں نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا ہے۔ اور شیخ حاتم کے ساتھ ان کی نشست میں شریک ہوا ہوں۔

۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں شہر سنبھل میں ہی ان کی وفات ہوئی اور ان کے ایک رفیق نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ ہمہ گفتند (رفت مردانہ)

نزہۃ الخواطر کا متن یہ ہے

الشیخ الفاضل عثمان بن أبی عثمان الحنفی البنگالی ثم السنبھلی، أحد العلماء المشہورین فی عصرہ، ولد ونشأ بأرض بنگالہ، وسافر للعلم فدخل سنبھل وقرأ علی الشیخ حاتم السنبھلی، ثم ذھب إلی گجرات وأخذ عن العلامۃ وجیہ الدین العلوی الگجراتی، ثم رجع إلی سنبھل وسکن بھا. ذکرہ کمال محمد السنبھلی فی الأسراریۃ، وقال البدایونی: الشیخ حاتم قرأ علیہ فی بدایۃ حالہ وکان یحضر لدیہ یلتمس الفاتحۃ فی نہایۃ أمرہ قال: إنی أدرکتہ فی صغر سنی وحضرت مجلسہ مع الشیخ حاتم.

مات سنۃ ثمانین وتسعمائۃ بمدینۃ سنبھل، فقال أحد أصحابہ ورخ لوفاتہ. ہمہ گفتند (رفت مردانہ)

شیخ عبدالحلیم سنبھلی

شیخ عبدالحلیم، شیخ حاتمؒ کے فرزند شیخ اسرائیلی خاندان کے فرد اور اپنے زمانے کے ممتاز عالم تھے۔ سنبھل میں پیدا ہوئے والد سے تکمیل علوم کی اور درس و تدریس میں زندگی گزار دی صاحب "نزہۃ الخواطر" کے بقول :-

پرہیزگار عالم شیخ عبدالحلیم بن حاتمؒ حنفی سنبھلی ایک بڑے عالم تھے۔ سنبھل میں پیدائش اور نشو و نما ہوئی۔ اپنے والد سے تکمیل علوم کی پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علمی مشاغل متقیانہ طرز زندگی قناعت اور توکل کے اعتبار سے وہ اپنے والد کے نقش قدم پر ہی گامزن رہے۔ ۹۸۹ھ (۱۵۸۰ء) میں انتقال ہوا۔

صاحب تذکرہ نزہۃ الخواطر نے الشیخ عبدالحلیم السنبھلی کے بارے میں لکھا ہے :-

الشیخ العالم الصالح عبدالحلیم بن حاتم الحنفی السنبھلی، أحد کبار العلماء، ولد ونشأ بمدینة سنبھل، وتخرج علی أبیه ولازمه مدة حیاته ثم تصدر للتدریس، وکان علی قدم أبیه فی الاشتغال بالعلم وصلاح الظاهر والقناعة والتوکل، مات سنة تسع و ثمانین وتسع مائة۔

(ص ۱۷۰)

نزہۃ الخواطر جلد چہارم

شیخ محمد کبنو سنبھلی

شیخ محمد کبنو بھی اپنے زمانے کے ممتاز و معروف عالم تھے۔ قادریہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خود بھی صوفی منش تھے۔ علوم و فنون کی تحصیل میں دیگر اکابر سنبھل کی طرح ریاضت سے کام لیا ۹۸۵ھ (مطابق ۱۵۷۶ء) میں وفات پائی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے حالات میں لکھا ہے :۔

"از سلسلہ قادریہ در ابتدائے حال ریاضت و مجاہدہ کشیدہ صاحب ذوق و وجد و آواز خوش داشت و در اوقاتی کہ حال بر و غالب می کرد سرودی می گفت کہ حاضراں را برقت می آورد و ہنوز ذوق آں سماع فقیر را در کام خان است و در اوائل کسب علوم ظاہر نمودہ و افادہ فرمودہ بودہ و بمظاہر صوری تعلق و تعشق تمام داشت و ہر گز بے عشق مجازی نبود دراں وادی عنان اختیار از دست دادہ بے تکلف و بے تعین از ورع و ذم خلق و فارغ واز رد و قبول آزاد می زیست بدین جہت شیخ محمد عاشق مشہور گشت در سنہ (۹۸۵ھ) نہصد و ہشتاد پنج رفت بدارالوصال کشیدہ "شسشم از شوال" تاریخ وفات او رشد۔ روح اللہ روحہ۔ (ص ۷ - ۸)

اخوند پنجو بابا

سید عبد الوہاب پنجو بابا۔ جنھیں ابو الفضل نے آئین اکبری میں شیخ پنجو سنبھلی لکھا ہے۔ چونکہ آپ بنیادی طور پر اسلام کے پانچوں ارکان کی تعلیم دیتے تھے۔ اس لیے پنجو بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد سنبھل کے رہنے والے تھے۔ جب ابراہیم لودی نے پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھوں شکست کھائی اور افغان امرا اور فوجی افسروں کا زوال شروع ہوا تو ان میں سے اکثر ترک وطن پر مجبور ہوئے جن میں آپ کے والد سید غازی بابا بھی صوبہ سرحد کی طرف تشریف لائے اور ستہ عفر میں گوخای باندھ کے یوسف زیوں میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ۱۵۳۸ء میں شیخ پنجو پیدا ہوئے۔

پنجو بابا نے علوم ظاہریہ کی تکمیل چوہا گجر اور ہندستان کے مختلف علاقوں میں کی۔ روہیل کھنڈ میں ایک موضع نوسلجام ہے اس کی مناسبت سے آپ کو نوسلجانی بھی کہا جاتا ہے آپ کے والد پشاور کے قریب موضع شاہ ڈھنڈ میں سکونت پذیر ہوئے۔

۴۵ برس کی عمر میں حضرت پنجو بابا نے موضع اکبر پورہ کی سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا آغاز کیا۔ میر احمد شاہ رضوانی اپنی کتاب تحفۃ الاولیا میں لکھتے ہیں کہ آپ کی درس گاہ سے تقریباً ۳ سو علما، علم کا آفتاب بن کر نکلے ۹۹۳/۱۵۸۵ میں آپ نے شیخ جلال الدین تھانوی کے خلیفہ میر ابو الفتح قنپاچی کے دست پر بیعت کی اور سلسلہ چشتیہ سے اپنا تعلق قائم کر لیا۔ ۱۶۳۰ء میں وفات ہوئی۔

خزینۃ الاصفیا کے مصنف غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ پنجو پشاوری اگرچہ گوجر قوم سے تھے لیکن اپنے وقت کے مشائخ کاملین میں سے تھے عبادت و ریاضت میں غرق اور اہل چشت کے طریقے کو پھیلانے میں سرگرم عمل اور ساعی تھے۔

پنجو بابا کا مزار اکبر پورے کے قریب مصری پورہ میں ہے۔ جہاں آج بھی ان کا عرس دھوم دھام سے ہوتا ہے۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا۔ سید قاسم محمود ص ۱۳۶

قاضی محمد معظّم سنبھلی

تاریخ شاہد ہے کہ ماضی بعید میں سنبھل ہر شعبہ حیات میں فخر روزگار رہا ہے۔ یہاں کے اکابر علما نے علم و دانش کی ایسی بیش بہا اور قابل قدر خدمات انجام دیں کہ ایک عالم سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوا، اسی سرزمین کے جیالے سپوتوں نے جہاد آزادی میں ایسے جوہر دکھائے اور اتنی فقید المثال قربانیاں دیں کہ خود جہاد کو رشک آئے اور یہی وہ مردم خیز خطہ ہے جہاں کے ادیبوں و شاعروں نے وہ تخلیقات و نگارشات پیش کیں جن سے ادب کے ایوان جگمگا رہے ہیں۔ اس تاریخ ساز قصبہ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں کے عالموں، ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی طرح قاضیوں نے بھی شہر اور بیرون شہر اپنی عظمت کا لوہا منوایا ان میں ایک اہم نام قاضی محمد معظم سنبھلی کا بھی ہے۔ دیگر اکابر علما، شعرا اور مجاہدین آزادی کی طرح ان کی حیات و خدمات پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ حکیم ظل الرحمان سنبھلی نے اپنے مضمون "قاضی محمد معظم سنبھلی" میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی بنیاد پر سطور ذیل قلم بند کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔

قاضی محمد معظم سنبھلی سنبھل کے ذی علم و ذی حیثیت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کی پیدائش ۱۷ ویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام محمد اعظم تھا جن کا سلسلہ نسب یہ ہے محمد اعظم بن محمد ہاشم بن محمد عاقل بن محمد حافظ بن علم محمد بن محمد اسحاق اسرائیلی۔

قاضی محمد معظم سنبھلی نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل سنبھل کے معروف مدرسہ ہلالی سرائے میں کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد دہلی دربار سے وابستہ ہو گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی قلعہ رائسین کے قاضی مقرر ہو گئے۔ فطری ذہانت و ذکاوت تقوے و پرہیزگاری اور عدل وانصاف کی بدولت جلد مشہور و معروف ہو گئے۔ ۱۷۰۹ء میں جب سردار دوست محمد خاں نے ریاست بھوپال کی بنا ڈالی، اور انتظامی امور کے لیے نظام قضا قائم کیا تو نگاہ انتخاب قاضی محمد معظم سنبھلی پر پڑی

رستم علی خاں مولف تاریخ ہند لکھتے ہیں :۔

"سردار دوست محمد خاں صاحب بانی ریاست بھوپال کے یہاں علما و مشائخ کی بڑی جماعت موجود رہتی تھی۔ وہ ایک سچے ا اور پکے مسلمان تھے اور ان کے دور میں کوئی لقمہ بھی مذہب کے بغیر نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ریاست کی شکیل کے بعد انتظامی امور کی طرف توجہ مبذول ہوئی تو ایک بیدار مغز قاضی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نگاہ انتخاب قاضی محمد معظم سنبھلی پر پڑی جو اس وقت بادشاہ دہلی کی طرف سے قلعہ رائسین (مدھیہ پردیش) کے قاضی تھے اور نہایت متقی اور بیدار مغز عالم تھے۔ بہ ہزار دقت ان کو ریاست کے قاضی القضاۃ کے عہدے کے لئے راضی کیا گیا اور خود اس مقصد کے لئے ایک فرمان جاری کیا گیا۔ یہ فرمان، جہاں قاضی صاحب کے تقرر کی تفصیلات کے مظہر ہے، وہاں دوست محمد خاں کی دینداری اور علم و فضل کے اعزاز و تکریم کا بھی شاہد ہے۔ قاضی صاحب کا دور دہلی میں شہنشاہ فرخ سیر کا دور ہے، اور وہ اسی کی طرف سے رائسین میں متعین تھے۔"

قاضی محمد معظم کو اگر معمار بھوپال کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ بھوپال کی تعمیر، تزئین اور ترقی میں انھوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان کے حسن تدبر، حسن انتظام اور فہم و فراست کے سبھی معترف تھے سچ تو یہ ہے کہ ریاست بھوپال کے لئے ان کی ذات شمع ہدایت اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ حکیم ظل الرحمان سنبھلی نے لکھا ہے :۔

"قاضی صاحب کے احترام کا یہ عالم تھا کہ جملہ افواج اور امرا ان پر بے انتہا اعتماد و عقیدت رکھتے تھے۔ وہ ایک جید عالم صاحب دل درویش اور پیکر علم و عمل بھی تھے اور فن سپہ گری کے رہبر بھی۔ ابتدا ًریاست کا دارالسلطنت اسلام نگر تھا لیکن توسیع سلطنت و تنگ دامانی اسلام نگر کسی موزوں وسیع کشادہ مقام کو دارالسلطنت بنانے کی دعوت دے رہی تھی تو قاضی صاحب کی نگاہ دوربین تالابوں کی سرزمین بھوپال پر پڑی۔ یہ خوش سواد، خوش منظر حسین و جمیل مقام دوست محمد خاں کو بہت پسند آیا اور اسی کو دارالسلطنت بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ ماہی گیروں کا ایک مختصر سا گاؤں تھا جو ہر چہار طرف سے صحرائی حسن سے معمور تھا۔ لہٰذا یہاں عہد قدیم کے حفاظتی طریقہ پر قلعہ اور آبادی کے گرد فصیل اور حصار شہر تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ وہ مقدس ہستی جس کے ہاتھوں قلعہ و حصار شہر کی بنیاد رکھی گئی وہ قاضی محمد معظم سنبھلی کی ذات گرامی تھی۔ ۹ رذی الحجہ ۱۱۲۵ھ بروز جمعہ اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قاضی صاحب ایک سایہ دار درخت کے نیچے ذکر الٰہی میں بھی مصروف رہتے اور نگرانی تعمیر بھی فرماتے۔ سپاہیوں اور مزدوروں سے تعمیری کام باوضو کراتے تھے اور بار بار تالاب پر جا کر وہاں کی پاکیزگی کی نگرانی فرماتے۔ سردار دوست محمد خاں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ قاضی صاحب کی ہدایت کے مطابق معماروں اور مزدوروں کے ساتھ کام میں لگے رہتے۔ ان کی دیکھا دیکھی تمام امرا بھی شریک کار رہتے۔"

قاضی محمد معظم سنبھلی صرف علم و عمل کے پیکر اور جلیل القدر قاضی ہی نہیں تھے بلکہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق امور رزم کے ماہر اور میدان کارزار کے شہسوار بھی تھے۔ انھوں نے متعدد معرکوں میں حصہ لے کر کردار شجاعت حاصل کی ۱۱۳۳ھ میں نواب برہان پور کی نواب حیدر آباد آصف جاہ کے ساتھ ہوئی جنگ میں نواب دوست محمد خاں کے بھائی امیر احمد خاں کے ہمراہ قاضی صاحب بھی شریک ہوئے جس میں نواب برہان پور کو شکست ہوئی۔ قاضی صاحب بھی گرفتار ہو گئے۔ جب آصف جاہ کو قاضی صاحب کی

حیثیت کا علم ہوا تو اس نے انھیں رہا کر دیا اور ان کی سفارش پر دوست محمد خاں کے لڑکے یار محمد خاں کو خلعت و ریاست واپس کی اور قاضی صاحب کو بھوپال جانے کی اجازت دے دی۔

قاضی محمد معظم تصنیف و تالیف اور شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے قرآن پاک کا ہندی ترجمہ بھی کیا تھا جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔

حکیم ظل الرحمان سنبھلی رقم طراز ہیں:۔

"بھوپال میں قاضی محمد معظم صاحب نے محلہ قاضی پورہ کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ جسے ان کے فرزند قاضی محمد معلم نے بھر پور آباد کیا اور ایک وسیع مسجد تعمیر کرائی۔ عرصہ دراز تک اسے جامع مسجد کی حیثیت حاصل رہی اس لئے کہ وسط شہر میں یہ پہلی مسجد تھی اور مسجد عیدیہ کے نام سے جانی جاتی تھی جو آج بھی موجود ہے مگر افسوس ہے کہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں قاضی پورہ اب مہاجن پورہ ہو گیا اور آج اس کے در و دیوار اخلاف کی ناقدری و ناحق شناسی کے مرثیہ خواں ہیں۔"

قاضی محمد معظم کے صاحبزادے قاضی محمد معلم کی دو اولادیں ہوئیں قاضی بدیع الدین و قاضی محمد یعقوب۔ قاضی معلم کے بعد قاضی محمد یعقوب قاضی بھوپال کے منصب پر فائز ہوئے انھیں کے ایک صاحبزادے قاضی احمد علی اس عہدہ جلیلہ تک پہنچ سکے۔ حالات کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ خاندانی جھگڑے میں قاضی احمد علی نے نواب قدسیہ بیگم کا ساتھ دیا اور ان کی دست برداری کے اعلان کے ساتھ خود بھی اس عہدے سے دست بردار ہو گئے اور نواب جہانگیر خاں کی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اسی باعث قاضی بدیع الدین کے دوسرے صاحبزادے قاضی محمد قاسم اس منصب پر فائز ہوئے۔

یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ عہد حاضر میں قاضی وجد الحسینی قاسمی اسی سلسلے کی کڑی ہیں جو آج عہدہ قضاۃ پر فائز ہیں قاضی صاحب متعدد

کتابوں کے مصنّف و مولف ہیں۔ 'ہندوستان اسلام کے سائے میں'
ان کی مشہور تصنیف ہے۔ بھوپال میں یہ منصب آج بھی سرکاری حیثیت کا
حامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تقسیم وطن سے قبل وہ مسلمانوں کے تمام دیوانی
و مالی مقدمات طے کرتا تھا۔ آج اس دائرہ عمل 'پرنسپل لا' تک محدود ہوگیا ہے۔
سنبھل میں بھی اس خاندان کے خلاف برتہا برس سے علمی و ادبی خدمات انجام
دے رہے ہیں۔ جنھیں عرف عام میں 'اسرائیلی خاندان' کہا جاتا ہے۔

(بشکریہ حکیم ظل الرحمٰن صاحب)

قاری حمید الدین سنبھلی

مولانا قاری حمید الدین سنبھلی مرحوم اکابر سنبھل کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے علم وفن کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور جو اپنے زمانۂ حیات میں مشہور و معروف بھی ہوئے اور قدر و منزلت سے بہرہ ور بھی ہوئے۔ قاری حمید الدین اپنے عہد کے ممتاز عالم اور ماہر فن تجوید و قرات تھے۔ انھوں نے درس و تدریس کے ذریعہ علم وفن کی قابل ذکر خدمات انجام دیں اور اپنی غیر معمولی علمیت و لیاقت کا سکہ جمایا انھوں نے حصول علوم و فنون کی خاطر ہند کے سفر بھی کئے۔ اور دین کی ترویج و اشاعت نیز علم وفن کے فروغ کے لئے ملک کے مختلف مقامات پر تعلیمی کے فرائض بھی خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔

علم و فن کے مرکز سنبھل کے ان گنت جلیل القدر فن کاروں و تخلیق کاروں کی طرح مولانا قاری حمید الدین بھی گوشۂ گمنامی میں جا پڑتے ان کے سوانحی حالات بھی پردۂ خفا میں چلے جاتے اور علمی خدمات بھی اگر مولانا امداد صابری دہلوی مرحوم اپنی مشہور تالیف "فیضان رحمت" شائع کردہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں بہت تفصیل کے ساتھ ان کے حالات کا ذکر نہ فرماتے مرحوم کے صاحبزادے مولانا برہان الدین سنبھلی کی تحریر کے مطابق قاری حمید الدین مرحوم نے 'حمید السوانح' کے نام سے خود نوشت سوانح لکھی تھی جو شائع نہیں ہو سکی۔ 'حمید السوانح' کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے پیش نظر کوائف و حالات اسی خود نوشت سوانح حیات سے ماخوذ ہیں۔

قاری حمید الدین کے مورث اعلیٰ شیخ حسن رضا ۱۵۲۶ء میں مغلیہ

سلطنت کے بانی شاہ بابر کے ہمراہ ہندوستان آئے موصوف فوج میں رسالہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ شیخ حسن رضا عربی النسل اور عالی نسب تھے انھوں نے سنبھل کے قدیم شاہی قلعہ (کوٹ) میں رہائش اختیار کی سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر ہونے کے بعد ان کی پانچویں پشت میں شیخ محمد بخش نے قدیم قلعہ کی سکونت ترک کر کے جدید قلعہ محلہ میاں سرائے میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ محمد بخش کے دوسرے فرزند سراج الدین جو ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے اپنے فضل و کمال کے باعث ملّا سراج الدین کے نام سے مشہور تھے" یہ قاری حمید الدین کے جد امجد ہیں۔ ملا سراج الدین کے دو لڑکے ہوئے۔ بڑے بیٹے حکیم مولوی سعید الدینؒ (پیدائش ۱۸۶۰ء) ۱۸۸۷ء میں ریاست بھرت پور کے والی راجہ جیونت سنگھ کے محکمہ مال کے افسر مقرر ہوئے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کی دوسری شادی نواب زمرد خاں (مرادآباد) کے خاندان کے ایک فرد بخش اللہ خاں کی صاجزادی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ریاست کے ایک مقام ڈیگ میں دوشنبہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۳ء ایک بچے کی ولادت ہوئی جس کا نام حمید الدین رکھا گیا۔

بچے کی بسم اللہ چار سال کی عمر میں ہوئی کم عمر ہی میں قرآن پاک ناظرہ مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد حفظ قرآن شروع کیا۔ لیکن ۱۹ جون ۱۹۰۱ء کو والدہ ماجدہ داغ مفارقت دے گئیں اور بچہ تعلیم و تربیت کے لئے دادا کے پاس بھیج دیا گیا۔ جہاں ماہرین فن و ممتاز اساتذہ کی نگرانی و تربیت میں حفظ قرآن مکمل ہو گیا اور مشہور و تاریخی مدرسہ "مدرسہ الشرع" (سنبھل) میں رسم و دستار بندی ادا کی گئی۔ اسی مدرسے میں انھوں نے عربی اور فارسی پڑھنے کا آغاز بھی کیا ۱۹۱۵ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور وہاں شیخ القراء مولانا عبد الوحید الہ آبادی سے فن تجوید و قراۃ میں دستگاہ حاصل کی اور وہیں دورہ حدیث سے بھی (۱۹۱۷ء) میں فراغت ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا محمود الحسن مالٹا میں قید فرنگ کاٹ رہے تھے اور مولانا انور شاہ کشمیری موصوف کے جانشین تھے، مولانا حمید الدین نے حدیث بخاری۔ شریف انھیں سے پڑھی۔ دورہ حدیث کی تکمیل اور سند فاضل کے استحقاق کے بعد بقیہ علوم

وفنون کی تحصیل کے لئے وہ دوبارہ دیوبند گئے اور معقولات کی کتابیں پڑھنے کے علاوہ تجوید و قرات اور فن طب بھی حاصل کیا۔ پھر علالت کی وجہ سے سنبھل واپس آگئے۔

بعدازاں ۱۹۲۰ء میں مرادآباد میں قرات کی تحصیل و تکمیل استاد القرا قاری عبداللہ تھانوی کی خدمت میں کی اور علم طب کے حصول کے لئے حکیم ہدایت علی لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ ساتھ ہی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے استاد حدیث مولانا سید فخرالدین سے علم الفرائض کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۰ء میں قاری عبدالرحمان مکیؒ اور قاری ضیا الدین الہ آبادی نے جامع مسجد مرادآباد میں تجوید و قرات کی تکمیل پر موصوف کی دستار بندی کی۔ اسی سال مرادآباد کے مدرسہ طبیہ میں فن طب کی سند تفویض کی گئی ۱۹۳۷ء میں مولوی حمیدالدین کو حرمین شریف کی حاضری اور وہاں کے قیام کی سعادت حاصل ہوئی ان کی علم کی تشنگی ابھی بجھی نہ تھی وہاں بھی حصول علم کی خاطر سرگرداں رہے۔ خود نوشت سوانح حیات میں انھوں نے سفر حجاز کی منظر کشی بڑی خوبی سے کی ہے۔ خصوصاً وہاں کے قیام میں فقر و افلاس کے دل دوز واقعات کی روداد درد و اثر کے ساتھ بیان کی ہے۔ "بندہ کی دیرینہ تمنّا و آرزو یعنی دارالعلوم حرم کے مدرسہ صولتیہ سے فیض خصوصی کا بلا واسطہ حصول" عنوان کے تحت مدرسہ میں داخلے اور شیخ القرا سے استفادے کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"اب تک دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ (زاداللہ تعالیٰ تعظیماً و تکریماً) کے فیض یافتہ حضرات قرا سے یا ان کے شاگردوں سے بالواسطہ فیض حاصل کیا جاتا رہا لیکن عرصے سے یہ تمنا و آرزو دل کی گہرائی میں تھی کاش اللہ تعالیٰ کوئی ایسا سبب پیدا فرمادیں کہ دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ سے بلا واسطہ فیض یاب ہوا جاسکے۔ یہ کوئی آسان و معمولی آرزو و تمنا نہ تھی کہ جلد حاصل ہوسکتی کہاں یہ ہندوستان کہاں حرم محترم؟ پھر کہاں اتنی دقتی گنجائش؟

غرض یہ کہ یہ حسرت و آرزو دل کی گہرائیوں میں پرورش پا رہی تھی اور ظاہری اسباب کچھ نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص فضل و کرم و بندہ نوازی سے بندے کو اس عالی مقام پر پہنچا کر سرفراز فرمایا۔ حضرت العلماء مولانا سید حسین احمد مدنی" شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مدظلہ العالی نے ایک گرامی نامہ حضرت

مولانا شفیع الدین نگینوی مہاجر مکی خلیفہ حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے نام بندے کو مرحمت فرمایا تھا وہ گرامی نامہ لے کر رباط، جہاں موصوف رہا کرتے تھے حاضر ہوا۔ والانامہ پڑھ کر موصوف بے حد خوش ہوئے اور بندہ سے بہت محبت اور خلوص سے پیش آئے اور فرمایا کہ جو کچھ بھی ضرورت و تکلیف ہو، ضرور اطلاع کرنا، بندے نے اپنی بھی آرزو و تمنا کا اظہار کیا کہ مدرسہ صولتیہ سے بلاواسطہ حصول فیض کا خواہش مند ہوں۔ چونکہ وہاں تک رسائی نہیں اس لئے راہبری فرمائی جائے حضرت مولانا نے فرمایا کہ باب عمرہ پر رئیس القرا مدرسہ شعبہ و قرات صولتیہ مکہ معظمہ رہتے ہیں میں تم کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔"

غرض یہ کہ اس طرح مدرسہ صولتیہ تک رسائی حاصل کی اور وہاں کے شیخ القرا سے استفادے اور حصول علم قرات کی راہ پیدا ہو گئی۔" موصوف نے لکھا ہے کہ وہ شعبان ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور دو تین دن کے بعد استفادے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایسے ہونہار اور علم کی سچی طلب رکھنے والے سے کون استاد متاثر نہ ہوگا۔ چنانچہ اساتذہ کرام نے ان پر خصوصی شفقت و عنایت کی نظر ڈالی اور دل جمعی سے تعلیم دینے کی سعی کی۔ آخر کار قرات وعشرہ کی تکمیل کے بعد انھیں سند تکمیل سے نوازا گیا۔ ان میں شوقِ حصول علم اور جذبۂ تکمیل فن اس قدر تھا کہ باضابطہ تعلیم کے سلسلے کے علاوہ بھی جہاں بھی اور جب کوئی موقع ہاتھ آتا وہ تشنگی مٹانے کی راہ ڈھونڈ لیتے۔ ایک واقعہ پر روشنی ہوئے لکھتے ہیں :۔

"شروع شروع میں جب کہ بندہ مکہ معظمہ پہنچا ہی تھا کہ ایک نوجوان عرب قاری کو باب الزیادہ پر قرآن شریف پڑھتے سنا، بھلا معلوم ہوا۔ ان کے مکان پر جا کر بندے نے چند روز ان سے بھی مشق کی اور دریافت کیا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں؟ تو قاری عبد اللہ صاحب مدرس مدرسہ صولتیہ کا نام بتایا۔"

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک پختہ کار ماہر فن تجوید اور عمر کے اعتبار سے بھی کہنہ سال، ایک نوجوان کی شاگردی میں گرانی یا عار محسوس کرنے کے بجائے اس پر فخر محسوس کرتا ہے اور اسی سے جذبہ و شوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مرحوم نے حصول تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کچھ سال مرادآباد میں

بھی قیام کیا اور مطب شروع کیا لیکن سنہ ۱۹۲۲ء میں جب ان کے پیر و مرشد مولانا تھانوی مراد آباد آئے تو انھوں نے قاری صاحب سے فرمایا کہ "علمی مشاغل کے مقابلے میں یہ چیز (مطب) مناسب نہیں ہے"۔ چنانچہ پیر و مرشد کے حکم پر انھوں نے مطب بند کر دیا۔ اور تدریس میں مستقل مشغول رہنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۴۱ھ، سنہ ۱۹۲۲ء کو مدرسہ محمود المدارس بنارس میں، وہاں کے صدر مدرس کی دعوت پر معلمی کے فرائض انجام دینے لگے۔

اسی زمانے میں بنارس میں موصوف کی مساعی جمیلہ سے مشاہیر علما کے اجتماعات بھی ہوئے جن میں ماہرین فن اساتذہ فارغ شدہ طلبا کی دستار بندی کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء اور سنہ ۱۹۳۴ء کے اجتماعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن میں مولانا شبیر احمد عثمانی، قاری عبد الرحمان مکی، قاری ضیاء الدین الہ آبادی اور قاری عبد اللہ مراد آبادی جیسے اکابرین نے شرکت کی تھی۔ مو محمد منظور نعمانی صاحب کے بقول "مولانا حمید الدین بنارس میں اکابر کے نمائندے تھے"۔

ہند اور بیرون ہند کے اسفار اور قیام میں علم و فن کی نمایاں خدمات انجام دیتے رہنے کے باوجود وہ اپنے وطن کو فراموش نہیں کر سکے اہل وطن کی خدمت اور ان میں تجوید و قرات کی اشاعت کا خیال ان کے دل میں گھر کئے رہا۔ ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے مکان کے نزدیک مدرسہ حمیدیہ تجوید القرآن' کی بنیاد رکھی۔ اس موقع پر رئیس شہر نواب عاشق حسین خاں مرحوم کی صدارت میں ایک یادگار جلسہ ہوا۔ جس میں ضلع کے سبھی اکابر علما نے شرکت کی۔ قاری حمید الدین نے اس مدرسہ کے فروغ اور علم تجوید و قرات کی اشاعت کے لئے پوری زندگی وقف کر دی۔ ۱۹۴۹ء میں قاری عبد اللہ صاحب کی ایما پر غیر منقسم صوبہ سرحد کے مشہور شہر عیسیٰ خیل' میں واقع مدرسہ معین الاسلام میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کی غرض سے کچھ مدت کے لئے سنبھل سے جدا ہوئے، اسی طرح کچھ عرصہ دہلی کے مشہور مدرسہ صدلقیہ میں بھی قیام کیا اور تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔

قاری حمید الدین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام فضل و کرم سے نوازا تھا۔ انھیں اپنے عہد کے جید علما و ممتاز اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف عطا ہوا' اکابر

وقت اور ماہرین فن سے استفادے کے مواقع ملے، اس کے ساتھ ہی وہ خوش الحانی کی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ جہاں جاتے، لوگ گرویدہ ہو جاتے ایک مرتبہ بنارس میں وہاں کے راجہ کی صدارت میں مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا تو موصوف سے اصرار کر کے تلاوت کرائی گئی۔ تلاوت سنتے ہی راجہ ادب سے کھڑے ہو گئے۔

موصوف کو ان معنوی صفات اور کمالات کے ساتھ ساتھ جسمانی وجاہت بھی عطا ہوئی تھی۔ مولف "فیضان رحمت" کی تصریح کے مطابق "موصوف سُرخی مائل گورے رنگ، اور چوڑے چہرے (ہلکے چیچک کے داغ) کے مالک تھے، جسم فربہ آواز سریلی اور بلند تھی۔ نہایت خوش اخلاق اور مرنجان مرنج، فیاض و مہمان نواز، خوش لباس اور وقت کے نہایت پابند تھے۔ باجماعت نماز کے اتنے رسیا و عادی کہ سفر میں بھی اس کا اہتمام کرتے۔ شب بیدار اور سحر خیز تلاوت قرآن بکثرت کرتے اور اکثر حفظ پڑھتے رہتے تھے۔ تراویح میں قرآن پاک سنانے کے اتنے پابند کہ مسلسل ۴۵ برس یہ سعادت حاصل کی۔ شدید بیماری کے باعث معذور ہو جانے پر ہی محروم سعادت ہوئے۔

قاری حمید الدین مرحوم نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے کافی اولادوں سے نوازا لیکن صرف تین اولادیں ہی حیات ہیں ایک صاحب زادی اور دو صاحب زادے۔ بڑے صاحبزادے مولانا برہان الدین سنبھلی جو دار العلوم ندوہ میں استاد اور معروف صاحب قلم ہیں۔ چھوٹے بیٹے سلطان الدین ہیں۔ جو قمر سنبھلی کے نام سے مشہور رہیں۔

مولانا قاری حمید الدین نے تقریباً نصف صدی تک علم و فن، دین و قرآن کی خدمت کی اور ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ان کے تلامذہ ارشد کی تعداد کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ خود موصوف نے اپنے مخصوص وہ ممتاز تلامذہ کی فہرست میں پونے دو سو نام شامل کئے ہیں۔ جن میں اکثر نے استاد کے فن میں قدرت کاملہ بھی حاصل کی۔

مختصر یہ کہ کتاب اللہ کا یہ خادم اور اپنے وقت کا ممتاز عالم علوم و فنون کی طویل و قابل قدر خدمات انجام دینے کے بعد ۲۵ شوال ۱۳۷۷ھ ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ (بشکریہ مولانا برہان الدین سنبھلی)

سرگرم مجاہدین آزادی

منشی امام الدین انصاری
حکیم ظہور الدین انصاری
منشی معین الدین انصاری
چودھری ریاست علی خاں
مولوی شیخ عبد الوحید
قاری شیخ عبد الحق
مولانا مبارک حسین
مولانا محمد اسماعیل
مولوی سلطان احمد
حافظ نور الحسن
مولانا شیخ عبد القیوم

منشی اِمام الدین انصاری ہادیؔ

برٹش انڈیا کمپنی کے نمائندوں نے جب اپنی شاطرانہ چالوں اور مکارانہ سیاست سے ہندوستان کو غلامی کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا اور ہندوستانیوں پر مظالم توڑنے کی انتہا کر دی تو سارے ملک میں اضطراب و بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وطن کے جیالے سپوتوں میں احساس آزادی بیدار ہونے لگا۔ وہ چنگاری جو کہیں دبی پڑی تھی ۱۸۵۷ء میں پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ پورے ملک کی طرح سنبھل کے دردمند اور محب وطن باشندوں میں جذبہ حریت پیدا ہوا۔ چنانچہ جب شہزادہ فیروز بخت سنبھل آیا تو یہاں کے شہریوں نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا اور اسکے ہمراہ مرادآباد جاکر انگریزی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ جس کی پاداش میں انھیں سخت سے سخت سزائیں دی گئیں، ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ متعدد سرفروشان وطن کو جام شہادت پینا پڑا، گھر بار اجڑے خاندان پر تباہی آئی۔ نہ جانے کتنے آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے۔ مولانا غلام رسول اور ان کے رفقا کو شہید کیا گیا۔ منشی امام الدین انصاری کو پھانسی دینے کے بعد ان کی نعش چونے کی بھٹی میں پھونک دی گئی۔ مختصر یہ کہ انگریزوں نے سنبھل کے مجاہدین آزادی پر جور و زیادتی کی حدیں توڑ دیں لیکن وہ مجاہدین کے جذبہ حریت و آزادی کو کم نہ کر سکے، ہر آزمائش ان کے حوصلوں کو جلا بخشتی رہی ہر سزا ان کے ذوق گناہ کو بڑھاتی رہی۔ یہ ہماری قومی تاریخ کا المیہ ہے کہ جن سرفروشوں نے مادر وطن کی آزادی اور ناموس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا" حصول آزادی کے بعد انھیں اس طرح فراموش کر دیا گیا کہ نئی نسل ان کی

حیات و کارناموں سے بالکل لاعلم ہے۔ یہی صورتحال سنبھل کے مجاہدین آزادی کی بھی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک مایہ ناز و نگانہ روزگار مجاہد آزادی ہوئے جن کے کارنامے اور قربانیاں قومی تاریخ میں آبِ زر سے حروف میں لکھی جانے کے قابل ہیں لیکن آج نقش و نگار طاق نسیاں، ہو کر رہ گئے ہیں۔ انھیں سرفروشوں میں ایک اہم اور ممتاز نام منشی امام الدین انصاری کا بھی ہے، جن کا تعارف سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مولوی امام الدین انصاری سنبھل کے ایک ممتاز اور ذی حیثیت شیخ انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان نے شعر و ادب، علم و فن اور ملک و قوم کی مایہ ناز خدمات انجام دے کر شہر کا نام روشن کیا ہے۔ اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ انصاری خاندان کس زمانے میں ہندوستان وارد ہوا۔ مولانا محمود احمد عباسی نے لکھا ہے کہ اس خاندان کے تین حقیقی بھائیوں میں سے ایک بھائی نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ یہ بھائی فرنگی محل لکھنؤ کے انصاری خاندان کے مورث اعلیٰ تھے دوسرے بھائی پانی پت میں مقیم ہوئے جو مشہور شاعر مولانا حالی کے جدّ امجد تھے اور تیسرے بھائی نے بجنور کے موضع باسٹہ کا انتخاب کیا جو اس زمانے میں اہم علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ اب وہاں شیخ فیضی کے مزار اور مدرسے کے کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ اکبر اعظم کے میر منشی شیخ ابوالفضل صدیقی کی آخری اولاد ایک خاتون تھیں۔ ان کا نکاح جن صاحب سے ہوا وہ باسٹہ کے ویران ہو جانے کے بعد سنبھل آکر آباد ہوئے۔ اسی خاندان کے اخلاف میں ایک روشن ستارہ طلوع ہوا جسے امام الدین انصاری کا نام دیا گیا۔ دستیاب شواہد کی بنا پر ان کی پیدائش اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں محلہ تمر داس سرائے میں ہوئی والد کا نام شیخ حیات الدین انصاری تھا۔ ابتدائی تعلیم انھیں کے سایہ عاطفت میں حاصل کی بعد ازاں دہلی چلے گئے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں قلعہ معلیٰ میں نائب میر منشی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ قلعہ کی ملازمت کے دوران انھوں نے منشی فرحت اللہ بیگ سے راہ و رسم پیدا کی اور فیض اٹھایا۔ اگرچہ موصوف قلعہ معلیٰ کے حالات سے مطمئن نہیں تھے لیکن بادشاہ اور میر منشی کے اصرار پر فرائض منصبی

انجام دے رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے تخت نشیں ہونے کے بعد جب صورتحال ناگفتہ بہ ہوگئی اور مرزا الٰہی بخش کی ریشہ دوانیوں سے مخلص اور وفاداروں کی حیثیت گھٹ گئی۔ نیز موقع پرست غالب آگئے تو منشی جی بد دل ہوکر ۱۸۴۰ء میں سنبھل واپس آگئے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی کے آغاز سے قبل تک انھوں نے مرادآباد میں وکالت کی اور ممتاز وکیل کی حیثیت سے معروف ہوگئے۔
پہلی تحریک آزادی کا شعلہ بھڑکتے ہی سنبھل میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا اور یہاں کے جیالے سپوت وطن عزیز کو غلامی کے شکنجے سے نجات دلانے کی غرض سے میدان عمل میں کود پڑے۔ منشی امام الدین انصاری تو میر کارواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جوش جہاد اور جذبہ حریت نے انھیں ہوش وخرد سے بیگانہ کردیا۔ اسی اثنا میں شہزادہ فیروز بخت سنبھل آیا تو انھوں نے والہانہ جذبے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دیا۔ انھوں نے شہزادے کی فوج کی میزبانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔
جب مرادآباد پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور مجاہدین آزادی کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو انگریز حاکموں نے ان کے خلاف اشتقای کارروائیاں شروع کردیں۔ ڈپٹی ولایت علی کو منشی امام الدین سے ذاتی پرخاش تھی۔ انھوں نے منشی جی کے خلاف انگریز حاکموں کے کان بھردیئے کہ انھیں صفائی کا موقع دینا خطرے سے خالی نہیں، انھیں کسی طرح کا موقع دیئے بغیر سخت سزا دی جائے۔ انگریزوں کو تو ایسے 'غداروں' کے خون سے انتقام کی پیاس بجھانا تھی۔ ایک 'ہندوستانی وہم وطن وفادار برطانیہ' کی صلاح نے آتش غضب کو ہوا دی اور ان کے لئے ایسی غضب ناک و دہشت انگیز سزا تجویز کی گئی کہ جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مرادآباد کے نواب مجّو خاں اور سنبھل کے منشی امام الدین انصاری کو سزائے موت سنادی گئی۔ نواب مجّو خاں کو ہاتھی کے پیروں تلے روند کر جام شہادت نوش کرایا گیا اور ساری جائداد ضبط کرلی گئی اور منشی امام الدین انصاری کو مرادآباد کے گل شہید کے مقتل میں پھانسی پر لٹکادیا گیا اور نعش چونے کی بھٹی میں پھونک دی گئی۔ ان کی کل جائداد بھی ضبط کرکے نیلام کردی گئی۔ مرحوم کی

بیوہ کو اپنے حقیقی ماموں کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔

شہید وطن منشی امام الدین انصاری سچے وطن پرست بھی تھے اور عالم باعمل بھی۔ ان کو اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ سخن فہمی و سخن سنجی خداداد تھی۔ انھوں نے جنگ کی مشقت کے ساتھ ساتھ عروس سخن کے گیسو بھی سنوارے۔ ان کا تخلص ہادیؔ تھا۔ جہاد آزادی میں ان کی حیثیت امام کی تھی تو کوچہ شاعری میں ہادیؔ کی۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا کے مصنف مولانا امداد صابری نے لکھا ہے:۔

"جناب ہادیؔ علوم دینیہ سے پوری طرح واقف تھے اور اپنے دور کے مشہور عالموں میں سے تھے۔ ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے:۔

جو رحمت کی ہے آدم پر تو ہادیؔ کو بھی بخشے گا
وہ تیری شان غفاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

حکیم ظہور الدّین انصاری عیش

منشی امام الدین انصاری مرحوم کے فرزند منشی حمید الدین انصاری بیخودؔ بھی اپنے عہد کی ممتاز ترین، قابل ترین اور مشہور ترین شخصیت تھے۔ موصوف کی غیر معمولی ذہانت، حسنِ تدبر اور فہم و فراست کی داستانیں سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ منشی حمید الدین انصاری میں وہ تمام صفات ورثہ میں پائیں جو ان کے والد ماجد میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ناگزیر حالات اور طبعی مجبوریوں کی وجہ سے موصوف جہاد آزادی میں عملاً تو شریک نہیں ہو سکے لیکن آزادی وطن کا جذبہ اور غلامی کا احساس ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے اور صاحب طرز نثر نگار بھی۔ ان کا کلام مسدس بیخودؔ کے نام سے شائع بھی ہوا تھا۔ جو اب تقریباً ناپید ہے۔ بیخودؔ سنبھلی ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۳ء بروز دوشنبہ بوقت پونے گیارہ بجے دن داغ مفارقت دے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۶ برس کی تھی نمونۂ کلام یہ ہے۔

سر حشر بے پردہ آؤ تو کہہ دو
جو محشر میں محشر اٹھاؤ تو کہہ دو
میرے جاگنے سے تمھیں کیا ملے گا
جو آؤ تو کہہ دو نہ آؤ تو کہہ دو

منشی حمید الدین انصاری بیخودؔ مرحوم کی پانچ اولادیں ہوئیں منشی وحید الدین متوفی ۱۹۵۸ء، منشی فرید الدین متوفی ۱۹۶۹ء، منشی نور الدین شہید فساد گڑھ مکتیشور ۱۹۴۶ء اور ایک صاحب زادی جو رائچور (کرناٹک)

میں مقیم ہیں۔

منشی فخرالدین کے صاحب زادے منشی شفیع الدین انصاری صاحب عمائد شہر میں سے ہیں۔ ان کے صاحب زادے منظر صفی طلباء اور نوجوانوں کے لیڈر تھے منشی حمید الدین کی چوتھی اولاد حکیم ظہور الدین انصاری تھے اور ان سے چھوٹے منشی معین الدین انصاری۔

منشی ظہور الدین انصاری عیش سنبھلی نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جب ان کا گھر مجاہدانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا اور دادا منشی امام الدین انصاری کی شہادت رنگ لاچکی تھی۔ وطن کے فرزانے خاک وطن کو اپنے خون سے لالہ زار کر رہے تھے اور خود ان کے اپنے بزرگ دیوانگی و فرزانگی کی شمعیں روشن کیے ہوئے تھے۔ درسِ قرآن، مذہبی تعلیم اور ابتدائی تعلیم (دنیاوی) کے ساتھ ساتھ مادرِ وطن کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تکمیلِ تعلیم کی بعد ازاں لکھنؤ سے تکمیلِ طب کا اعزاز حاصل کیا۔

حضرت عیش انصاری نے مولانا اعزاز علی صاحب، شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی مولانا محمد ابراہیم سنبھلی اور مولانا عبدالمجید صاحب سنبھلی جیسے اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ سبھی اساتذہ اپنے ہونہار و ذہین شاگرد سے بہت محبت کرتے تھے اور شاگرد کو بھی اپنے اساتذہ کرام کی علمیت و لیاقت پر بہت فخر تھا۔

اب سے نصف صدی پیشتر شرفا کا ملازمت کرنا بہت معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ بالخصوص انگریز سرکار کی ملازمت سے نفرت کے اثرات ابھی باقی تھے اور اور ان روایات کی پاسداری میں تعلیم یافتہ حضرات آزاد پیشوں کو ترجیح دیتے تھے ان میں وکالت اور طبابت کو اولیت حاصل تھی۔ انصاری خاندان میں مذہبی اثرات غالب تھے۔ وکالت کے پیشے کو جائز تصور نہیں کیا جاتا تھا اس لیے کہ وکیل کو اپنے پیشے کی دکان چمکانے کے لیے مبالغہ اور جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے اِس خاندان میں طباعت کا چلن زیادہ رہا۔ حکیم ظہور الدین انصاری کے حقیقی خالو حکیم فرید احمد عباسی مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ موصوف ریاست حیدرآباد کے شاہی طبیب بھی رہے اور دہلی کے طبیہ

کالج کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے تھے ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے وہیں ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا۔ حکیم فرید احمد عباسی مرحوم، مشہور کتاب، خلافت معاویہ ویزید، کے مصنف محمود احمد عباسی کے بڑے بھائی تھے۔

طباعت حکیم عیش مرحوم کا پیشہ بھی تھا اور خاندانی ورثہ بھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مراد آباد، گڑھ مکتیشور، حسن پور کلاں جمشید پور، ٹاٹا نگر اور سنبھل وغیرہ کے سفر بھی کیے اور قیام فرما بھی ہوئے لیکن ان کا دل ان جھمیلوں میں نہیں لگتا تھا۔ ان کا اصل میدان اور مذاق مذہب اور ادب تھا۔ غیر مذہبی وغیر ادبی حضرات سے ان کا مزاج میل نہیں کھاتا تھا۔ فطرتاً کم گو، کم سخن و کم آمیز بھی تھے اس کا سبب غالباً یہی تھا کہ انھیں ہم مذاق اصحاب کی صحبتیں میسّر نہ تھیں۔ مولانا عابد حسین خلش، مولانا محمد اسماعیل سنبھلی اور مولانا محمد یوسف سے ربط خاص تھا یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ ان کا خاندان ہمیشہ سے دیوبندی مسلک کا حامل ہے لیکن انھوں نے خود کو ہمیشہ گروہ بندی سے بالاتر رکھا ان کا نظریہ "صلح کل" اور عمل وسیع المشربی، کا ترجمان رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ہر طبقہ و گروہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے رویے کو بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔

منشی جی کا خاندان قومی سیاست میں بھی پیش پیش رہا جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ جہاد آزادی میں اس خاندان نے تاریخ ساز کردار نبھایا اور فقید المثال کارنامے انجام دے کر قوم و ملک کا نام روشن کیا ہے آزادی سے قبل انصاری بلڈنگ، قومی سیاست کا اہم ترین مرکز تھی۔ سنبھل میں تحریک آزادی کی شمع یہیں سے روشن ہوئی اور اسی خاندان کے ایک جیالے سپوت آزادی وطن کی خاطر اپنا سب قربان کر دینے، حتیٰ کہ جان نثار کرنے کی مقدس روایت کی بنا ڈالی۔ حکیم ظہور الدین نے اسی جذبۂ حریت کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ وہ اس روایت سے بے نیاز کیسے رہ سکتے تھے۔

وہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر عملی سیاست میں تو شریک نہیں ہو سکے لیکن خیالات اور نظریات کے اعتبار سے سچے قوم پرست و کانگریسی بھی تھے اور قربانی و ایثار کی راہ پر گامزن بھی وہ تو دو قومی نظریے کو مہلک تصور کرتے

سکھے اور آخر وقت تک اسی نظریے پر قائم رہے۔ انھیں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بہت عقیدت تھی۔

حکیم صاحب ذہانت و ذکاوت کا پیکر تھے مطالعہ و مشاہدے کا ذوق فطری تھا۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ وسیع و عمیق تھا۔ ان کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد تلاوت کرتے اور حدیث کا مطالعہ کرتے اس معمول پر آخر تک اتنی سختی سے پابند رہے کہ نہ کبھی ناغہ ہوا اور نہ کبھی وقت میں تخفیف ہوئی۔ اسی کے ساتھ عربی فارسی اور اردو ادبیات کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ شاعری سے خصوصی لگاؤ تھا لیکن دیگر اصناف ادب بھی ان کی توجہ سے محروم نہ رہیں۔ یہاں تک کہ ناول اور افسانے بھی اکثر پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں ناول و افسانے پڑھنا معیوب بات متصور ہوتی تھی چنانچہ بزرگوں کے سامنے یہ جرأت کرنا گستاخی کے مترادف تھی۔ موصوف یہ گستاخی، حظ اٹھانے کے لیے نہیں، اصناف ادب کے مطالعے کی غرض سے فرماتے تھے۔

حکیم ظہور الدین صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ ان کی تالیفات میں سب سے زیادہ اہم "شرح مقامات حریری" ہے۔ یہ عربی انشاء کی اہم کتاب ہے اور یونیورسٹیوں و عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ موصوف کی شرح طلبا میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن طبع ہوئے، کچھ ناشرین نے جعلی نسخے بھی چھاپے ہیں۔ مرحوم نے ایک رسالہ کائنات بھی جاری کیا تھا جس کے چند شمارے شائع ہوئے پھر یہ ابدی نیند سو گیا۔

حکیم ظہور الدین عیش انصاری جیسی جامع کمالات اور مجموعہ اوصاف شخصیت کا یوں تو ہر پہلو قابل ذکر و قابل فخر ہے لیکن سب سے زیادہ توجہ کی مستحق ان کی شاعری ہے چوں کہ انھیں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر ٹکسال قدرت حاصل تھی۔ اس لیے تینوں زبانوں میں مشق سخن بھی فرماتے تھے انھیں فن عروض پر بھی کامل عبور تھا اور تاریخ گوئی پر بھی۔ ان کا کلام، قادر الکلامی کہنہ مشقی و فنی مہارت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے فن میں کلاسیکی اقدار کی پاسداری اور عصری تقاضوں کی عکاسی ہے، گہرائی و گیرائی ہے پختگی و شگفتگی

ہے۔ آورد بہت کم، آمد زیادہ ہے اگرچہ موصوف نے اپنا کلام ردیف دار مدوّن کر لیا تھا لیکن حالات نے طبع کرانے کی مہلت نہ دی۔ نمونہ کلام یہ ہے :۔

شراب ناب حرام ست بالیقیں حرام
بہ دست دوست حرام ست گفتگو ایں جاست

کہاں کٹتے ہیں روز و شب جانتا ہوں
میں واعظ کے حالات سب جانتا ہوں

مسرت و عیش و شادمانی ہیں چند الفاظ بے معنی
تمام عالم میں خاک چھانی کہیں کسی کا پتہ نہیں ہے

پسند آیا ہوں رحمت کو کبھی تو گنج مرقد میں
جواہر کی طرح محفوظ رکھوایا گیا ہوں

ہمیشہ لب پہ شکایت شراب خانے کی
کبھی تو بات کرے آدمی ٹھکانے کی

سر منبر اور ہجوم سے شیخ صاحب
خطابت کی ساری لطافت بدل دی
فقط ایک جرعے نے محتسب کے
مزاجِ گرامی کی حالت بدل دی

ترجمانِ دل بنے گا بڑھتے بڑھتے دست شوق
کھنچتے کھنچتے آپ تصویر حیا ہو جائیں گے۔

وہ اب آرہے ہیں، ابھی آرہے ہیں
یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں

نہ جانے وہ کیا کہہ رہے تھے عدو سے
میں پہنچا تو طرزِ خطابت بدل دی

ٹھوکریں کھاتے ہوئے، جھومتے دیوانے سے
حضرت عیش چلے آتے ہیں میخانے میں

حضرت حکیم الدین عیش انصاری سنہ ۱۹۰۲ء میں عالمِ ارواح سے عالمِ آب وگل میں تشریف لائے اور ۲۳ر دسمبر سنہ ۱۹۷۸ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے۔ انھوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک علوم وفنون اور شعر وادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں اور اپنی بیش قیمت تخلیقات ونگارشات کے ذریعہ زبان وادب کا دامن مالا مال کیا۔ انھیں غیر معمولی ذہانت، طباعی، علم، فن شاعری میں مہارت اور علمی وادبی ذوق بڑی حد تک اپنے والد ماجد منشی حمید الدین انصاری بجوؔد سنبھلی سے ورثے میں ملا تھا جسے انھوں نے حق بہ حق دار رسید، کا استحقاق واعزاز بخشا اور یہ ترکہ انھوں نے اپنی اولاد میں بھی بخوبی تقسیم کیا۔ مرحوم کے صاحب زادگان صبیح الدین احمد نقش انصاری اور ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری اپنے اپنے میدان کے شہسوار ہیں۔ جناب صبیح الدین انصاری انگریزی ادبیات کے استاد ومعروف معلم ہیں۔ لیکن نقش انصاری کے نام سے اردو شعر وادب میں بھی نقوش ثبت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ اردو سکشن کے انچارج ہی نہیں، تشنگانِ ادب اور طالبانِ علم کے لیے مینارہ نور بھی ہیں۔ چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ عشقِ ادب بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب " لغتہ اور غالب" غالبیات میں اہم اضافہ ہے۔ مضامین ومقالات بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی سب

سے اہم اور نہایت مفید خدمت ہے اشاریہ (ببلوگرافی) کی تیاری جس میں دیدہ ریزی و باریک بینی کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ضرورت موصوف بحسن وخوبی پوری کر رہے ہیں۔ خدا کرے موصوف کی ضیا پاشی و ضیا باری کا سلسلہ جاری رہے اور طلبا و تشنگانِ علم و ادب فیض یاب ہوتے رہیں۔

منشی معین الدین انصاری

منشی امام الدین کے بیٹے منشی حمید الدین مرحوم بعض ناگزیر مجبوریوں کے
باعث تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک نہ سکے۔ لیکن انھوں نے اپنے وطن پرد
خیالات اور غاصبانہ جذبات کو اپنی اولادوں میں منتقل کردیا۔ یہ ان کے باغیا
خیالات و رجحانات کا اثر تھا کہ ان کے بڑے بیٹے منشی نورالدین نے تحریک خلاف
میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور میرٹھ ضلع کانگریس کے صدر کی حیثیت سے آزادی
وطن کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ آخر کار گرفتار ہوئے اور میرٹھ جیل میں قید کرد
گئے۔ اس وقت وہاں مولانا آزاد بھی اسیر فرنگ تھے۔ مولانا کی بعض صحبت سے ان کے
خیالات کو جلا ملی۔ رہائی کے بعد گڑھ مکتیشور میں رہائش اختیار کرکے خدمت وطن م
لگ گئے۔ ۱۹۴۶ء کے قتل عام میں بلوائیوں کے ہاتھ شہید کئے گئے۔ چھوٹے بھائی
معین الدین بھی بزرگوں کی تقلید میں پیچھے نہ رہے اور اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہو
تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔

منشی معین الدین اگست ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سنبھل میں
ہی حاصل کی۔ اوائل عمر سے ہی قومی تحریک میں حصہ لینے لگے ۱۹۲۹ء میں کانگریس
کی رکنیت اختیار کی اور سماجی و قومی خدمت میں جٹ گئے۔ ایک مدت تک سنبھل
کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو باغیانہ تقاریر کی پاداش
میں گرفتار ہوئے۔ جیل میں طرح طرح کی صعوبتیں جھیلیں۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں
گاندھی اروِن معاہدے کے تحت رہائی ملی ۱۹۴۱ء میں جب بمبئی میں کانگریس
کمیٹی کی مجلس عاملہ کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا تو انھیں بھی حراست

میں لے لیا گیا۔ حکام نے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا کہ وہ کانگریس کی حمایت ترک کر کے انگریزوں کی وفاداری کا وعدہ کر لیں لیکن ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ ۱۰ راگست کو انھیں مرادآباد جیل میں قید کر دیا گیا۔ جہاں مولانا حسین احمد مدنیؒ پہلے سے ہی قید تھے۔ نظر بندوں کو پانچ کوٹھریوں والا حصہ دیا گیا اور سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ایک ہفتہ کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، مولانا سید محمد میاں، مولانا اسمٰعیل سنبھلی مرحوم، قاری عبداللہ، حافظ محمد ابراہیم مرحوم وغیرہ بھی یہیں بھیج دیئے گئے۔ حافظ محمد ابراہیم اور منشی جی کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں ان کے بعض خیر خواہوں نے ان کی لاعلمی میں پیرول پر رہا کرنے کی درخواست دے دی جو منظور ہو گئی لیکن انھوں نے رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں سید محمد میاں اور منشی جی کے سوا سبھی قیدی پیرول پر رہا ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں جب گاندھی جی نے جواہر لال نہرو کو اپنا جانشین مقرر کر کے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بین اقوامی سیاست نے نیا موڑ لیا۔ جنگ عظیم کے اثرات ہندوستان میں بھی نمایاں ہونے لگے تو منشی جی کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اور وہ قومی و ملکی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۷ رفروری ۱۹۶۲ء کو ریاستی حکومت نے انھیں تام پتر دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ان کی وفات ہو گئی اور آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

چودھری ریاست علی خاں

سنبھل کے جانباز سپوتوں و سرفروشوں میں چودھری محمد ریاست علی خا
کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ ان کا تعلق چودھری سرائے کے ایک معزز و ذی
حیثیت خاندان سے ہے ۔ ان کے والد ماجد چودھری ممتاز علی خاں مسلم راجپوت
تھے ، اور عمائدین شہر میں شمار کئے جاتے تھے ۔ ۱۸۹۴ء میں ان کے گھر میں ایک ا
لڑکے نے جنم لیا جو بعد میں چودھری محمد ریاست علی خاں کے نام سے مشہور و ممتا
ہوا ۔ ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی ۔ زمیندار گھرانے میں آنکھ
کھولنے کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے ۔ عیش و عشرت کے ماحول میں پروان چڑ
کے باوجود بچپن ہی سے وطن پرستانہ جذبات موجزن ہونے لگے تھے ۔ عمر کے ساتھ سا
نشۂ حُبّ قومی میں بھی اضافہ ہوتا رہا ۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب ان کی
عمر بیس سال بھی نہیں ہوئی تھی ، وہ میدان کارزار میں کود پڑے ۔ یہ وہ زمانہ تھا
جب سنبھل میں تحریک آزادی عہد طفلی سے عہد شباب میں داخل ہو رہی تھی ۔ لالہ روپ
کشور ، لالہ چندو لال ، مولانا محمد اسماعیل ، مولوی عبد القیوم برطانی سامراج کے
خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں پیش پیش تھے اور یہاں کا گھر گھر متاثر ہو رہا تھا ۔
برطانوی سامراج کے درندہ صفت نمائندے شمع آزادی کے پروانوں پر مظالم ڈھا
رہے تھے ۔ سنبھل کے سرفروشان وطن بھی ان کی نگاہ میں بُری طرح کھٹک رہے تھے ۔
ایک طرف جیالے سپوت مادر وطن کو برطانوی شکنجے سے آزاد کرانے کے لئے جان کی باز
لگائے ہوئے تھے تو دوسری طرف انگریز آقا انھیں تہہ تیغ کرنے کی گھات میں تھے
سنبھل کے مجاہدین آزادی بھی نشانہ بنے اور انھیں ان کے ارادوں سے باز

رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جانے لگی - ان پر مظالم وستم کے پہاڑ بھی توڑے گئے۔ عیاری ومکاری سے بھی کام لیا گیا اور ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جو ان کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔ لیکن ہر کوشش ناکام ہوئی اور ہر حربہ بیکار گیا - مجاہدین آزادی کے پائے استقامت ڈگمگائے نہیں۔ وہ نئی توانائی اور نئے عزائم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے - خلافت تحریک نے تحریک آزادی میں نئی روح پھونکی - وہ تحریک جو چند سرفروشوں کی رہین منّت تھی، خلافت تحریک کے اثر سے عوامی تحریک بن گئی - انگریز سے نفرت اور تحریک آزادی میں شمولیت کا جذبہ عام ہونے لگا - انگریز آقاؤں نے جیل خانہ کا دروازہ کھول دیا -

دوسرے مجاہدین آزادی کے ساتھ ساتھ چودھری **محمد** ریاست علی خاں بھی سرگرم عمل تھے - کبھی چھپ کر کبھی اعلانیہ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دینے میں مصروف تھے کہ دستور ہند کی دفعہ ۱۷ الف کے تحت گرفتار کر لئے گئے اور مراد آباد جیل میں قید کر دیئے گئے۔

۸ر اپریل ۱۹۲۲ء کو رہائی نصیب ہوئی - رہا ہونے کے بعد وہ پھر اپنے مشن میں لگ گئے - تحریک آزادی کو منظم کرنے، انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے آزادی بیدار کرنے کا کام جاری ہی تھا کہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی - اور دو سال قید بامشقت کی سزا ملی - جیل میں بان بٹنے اور چکی پیسنے کا کام سپرد کیا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں جیل سے رہا ہونے کے بعد چودھری ریاست علی خاں نے زمینداری سے کنارہ کشی اختیار کر کے فقیری لے لی، اور زندگی کے آخری سانس تک قومی خدمات میں لگے رہے -

۱۹۶۹ء کی مارچ کو ۷۵ سال کی عمر میں شمع آزادی کا یہ پروانہ ابدی نیند سو گیا اور آبائی قبرستان میں اپنے دادا بہار الدین کے پہلو میں سپرد خاک ہوا - چودھری سرائے میں واقع قبر پر تاریخ وفات کندہ ہے -

چودھری ریاست علی خاں کی تین اولادیں ہوئیں - محمد ابوبکر خاں، محمد عمر خاں اور بلقیس بیگم - بڑے صاحبزادے **محمد** ابوبکر خاں سنبھل میں مقیم ہیں اور چھوٹے صاحبزادے اور صاحبزادی پاکستان میں ہیں -

مولوی شیخ عبدالوحید

مولوی عبدالوحید سنبھل کے قدیم شیخ ترک خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ماجد مولوی عبدالمجید اپنے عہد کے ممتاز عالم دین اور معروف استاد تھے۔ ان کا شمار دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے اکابر معلموں میں ہوتا تھا۔ حلقہ تلامذہ وسیع تھا۔ سمرقند بخارا، جیسے دور دراز کے تشنگان علم دین، ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے مشتاق رہتے تھے۔ مولانا محمد منظور نعمانی جیسے معروف عالم نے بھی ان سے فیض حاصل کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سنبھل کے بیشتر علمائے جن میں دیوبندی و بریلوی دونوں مسلک کے عالم شامل ہیں، مولوی عبد المجید مرحوم (متوفی ۱۹۵۳ء) کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور علوم دین سے فیض یاب ہوئے۔ انھیں کے یہاں ۱۸۹۸ء میں جس بچے کی ولادت ہوئی، اس کا نام عبدالوحید رکھا گیا۔

مولوی عبدالوحید نے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور علمی ماحول میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی پھر مدرسہ سراج العلوم سنبھل، مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور دارالعلوم دیوبند جیسے مشہور و معروف مدارس سے فارغ التحصیل ہوئے۔ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم و ملت کی خدمت کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔ گرچہ اجداد زمیندار گھرانے کی روایات کے امین تھے اور زراعت و کاشت کاری ان کا آبائی پیشہ تھا مگر مولوی عبدالمجید مرحوم نے علوم دین کی خدمت کو مقصد حیات بنایا۔ یہی اثر مولوی عبدالوحید پر بھی غالب رہا۔ انھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد، خدمت دین کے ساتھ خدمت وطن کو اپنا شعار بنایا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان کے دیگر مقامات

بقیہ ص ۸۵ پر

قاری عبدالحق

سرگرم مجاہد آزادی قاری عبدالحق، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کی روشن مثال تھے۔ کردار کے غازی، عمل کے مجاہد، انسانیت کے پرستار، مذہب کے شیدائی، حق و صداقت کے پیکر قاری عبدالحق مرحوم مادر وطن کے ان جیالے سپوتوں میں ایک تھے جن کی پوری زندگی قربانی وایثار سے عبارت ہے۔ وہ ۱۸۸۰ء میں سرائے ترین کے ایک ذی عزت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قاری صاحب کے والد الحاج عبداللہ بہترین امانت دار اور ممتاز تاجر تھے۔ ان کا انتقال مکہ معظمہ میں ہوا۔ ان کے وصال کی خبر ایک درویش نے دی تھی جو ان کے دروازے پر جذبہ کی حالت میں پڑا رہتا تھا۔ قاری صاحب کی والدہ مریم مرحومہ حافظ محمد رفیق کی صاحبزادی تھیں اور خود بھی حافظ تھیں۔ حافظ محمد رفیق اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ ان کے شاگرد دور دراز تک پھیلے ہوئے ہیں۔ قاری صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، جہاں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایک قریبی ساتھی مولوی حبیب اللہ شاہجہاں پوری کے ہمراہ قیام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں قرآن پاک حفظ کیا۔ بعد ازاں قاری حمید اللہ سنبھلی اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے استاد قاری عبداللہ مراد آبادی سے استفادہ کیا۔ مراد آباد کے قیام کے دوران حافظ عبد الرحمن مراد آبادی سے قربت بڑھی جو عقیدت کا روپ اختیار کر گئی۔ حافظ عبد الرحمن حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی کے خلیفہ و مجاز تھے۔ سائیں توکل شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے۔ قاری صاحب کا حافظ عبدالرحمن سے

عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ سرائے ترین سنبھل سے مراد آباد تک اکثر و بیشتر پیدل اور کبھی کبھی سائیکل سے ملاقات کرنے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں قاری صاحب کے دل میں حج کا شوق پیدا ہوا۔ سفر کے لئے کچھ پاس نہ تھا صرف ایک پیسہ جیب میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن جذبہ شوق زیارت اتنا بڑھا کہ حافظ عبدالرحمٰن مرحوم کی اجازت لے کر چل پڑے۔ حافظ جی نے اپنے پیر حاجی محب الدین مکی کو تعارفی رقعہ لکھ کر دیا جو قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مکہ معظمہ میں خلیفہ تھے۔ وہاں ایک سال قیام کیا۔ قیام کے دوران قاری عبدالحیؒ نے دعا حزب البحر کا عمل حاصل کیا اور مکمل عامل بن کر واپس آئے۔

حافظ عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد قاری عبدالحیؒ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی اور یہیں سے ان کی زندگی میں انقلاب آیا۔ روحانیت مذہبیت کا علمبردار سیاست و وطنیت کی طرف راغب ہوا۔ مولانا مدنی کی فعال و متحرک شخصیت سے وہ اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ تحریک آزادی کے سرگرم و بے لوث مجاہد بن کر ابھرے۔ مولانا مدنیؒ کی رہنمائی و سرپرستی میں کانگریس اور جمعیت علما کے پلیٹ فارم سے خدمت وطن میں جی جان سے لگ گئے۔ سول نافرمانیوں کی تحریک میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور نو ماہ کی قید بامشقت کاٹی۔ رہا ہونے کے بعد حصول آزادی تک وہ اسی جذبے سے سرشار رہے۔ مصائب و آلام کا سامنا کیا۔ ایثار و قربانی سے کام لیتے رہے، پریشانیوں و تکلیفوں کو دعوت دیتے رہے۔ لیکن جو قدم اٹھ چکے تھے پیچھے نہیں ہٹائے۔

ہندوستان آزاد ہونے کے بعد قاری عبدالحی مرحوم نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور مذہبی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ پہلے مدرسی و معلمی کا فریضہ انجام دیا پھر خدمت خلق کی طرف تعویذ و عملیات کا سلسلہ شروع کیا جو تادم آخر جاری رہا۔

قاری عبدالحی مرحوم کی خدمات کے صلے میں ریاستی حکومت نے انھیں تامر پتر سے بھی نوازا اور مرکزی و ریاستی حکومت کی جانب سے پنشن بھی دی گئی جو تاحیات جاری رہی۔ یکم ستمبر ۱۹۸۴ء کو مادر وطن کا یہ سرگرم مجاہد ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت

دے گیا۔ اتوار ۲ ستمبر کو ۹ بجے دن آبائی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

قاری عبدالحق مرحوم نے چار شادیاں کیں اور چودہ اولادیں ہوئیں۔ ایک صاحبزادے عبدالخالق اور ایک صاحبزادی مسماۃ اللہ دئی بیگم حیات ہیں۔ مرحوم کو نثر نگاری کا ملکہ بھی حاصل تھا اور نظم نگاری کا بھی۔ ایک منظوم تصنیف "مسدس حق" مرحوم کی یادگار ہے۔ مرحوم کے انتقال کے بعد مولوی محمد ظریف نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

ہم شریک و مشورہ اے نور حق
ہست حضرت حاجی قاری عبد حق
نقش تعویذش مثالِ نقش قدر
فیض او بر خاص و عامی مثلِ بدر
عامل کامل ولی مرد خدا
پائے او بر پائے فخر انبیا
ہم جمالی ہم جلالی شان وا
کان علم و مخزن خلق نکو

مولانا مبارک حسین محمودی

مولانا مبارک حسین سنبھلی بھی مجاہدین سنبھل کے اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ناموس وطن اور عزت نفس کی خاطر انگریزی سامراج سے مورچہ لیا اور آزادیٔ وطن کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ انھوں نے مصائب و آلام کا سامنا بھی کیا۔ زنداں کی تاریک و تنگ کوٹھریوں کی قید بھی بھگتی اور طرح طرح کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ لیکن ان کے دل میں حب الوطنی کی جو آگ سلگی تھی وقت کے طوفان کے ساتھ تیز تر ہوتی گئی اور وہ زندگی کی آخری سانس تک اسی راہ پر چلتے رہے، جس کا انتخاب انھوں نے کیا تھا۔

"مولانا مبارک حسین صاحب ۱۸۷۸ء میں سنبھل کے محلہ دیپا سرائے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ احمد حسین تھا جو کھانڈ کے کاروباری حضرات میں انتہائی متمول درجہ کے تھے پورے ایک موضع کے زمیندار تھے۔ مذہبی رجحانات کے حامل اور فارسی کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے تھے۔"

(مولانا مبارک حسین سنبھلی: ظل الرحمٰن الجمعیتہ دہلی ۷/مارچ ۷۵ء)

مولانا مبارک حسین نے ابتدائی تعلیم وطن میں ہی حاصل کی۔ مکتبی تعلیم کے ساتھ ایک پشاوری عالم بھی اتالیف مقرر کیے گئے۔ جنھوں نے اپنے طالب علم کو فلسفہ منطق اور ہیئت پر عبور حاصل کرایا۔ ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور دورہ حدیث پڑھا۔ ۱۹۱۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

(ماخوذ از تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم مرتبہ سید محبوب رضوی) صفحہ

دارالعلوم دیوبند میں مولانا نے مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا شاہ انورؒ کی شاگردی

کا شرف حاصل کیا تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان کے ہم سبق تھے۔ وہ ایک ذہین، حساس اور سعادت مند طالب علم تھے۔ مولانا محمود الحسن نے اپنے شاگرد کی فطری صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ یہ مولانا کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ ان کے دل میں بھی وہی جذبہ حریت موجیں مارنے لگا جو استاذ کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھیں خطابت کا شوق تو طالب علمی زمانے سے ہی تھا، مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی اور سنجیدگی آتی گئی اور یہ مرد مجاہد جذبہ حب قومی سے سرشار ہو اٹھا۔ درس اثنا مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی جو ان کے ہم جماعت اور ہم سبق تھے، کی صحبتوں نے ان کے دل میں مناظرہ کا ذوق بھر دیا۔ اور وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز مناظر کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء کے ایک مناظرے میں بریلی میں ہوا اور جس میں مولانا ثناء اللہ اور بہت سے مقتدر علماء شریک تھے، مولانا مبارک حسین نے اپنی جماعت کی نمائندگی کی اور زبردست کامیابی حاصل کی۔ یہیں انھیں "شیر اسلام" کے خطاب سے نوازا گیا۔

۱۹۱۵ء میں انھوں نے خورجہ میں قاسم العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ جو آج بھی اہم دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اسی زمانے میں دار العلوم میں صدر مدرس کی ضرورت پیش آئی تو مبارک حسین سنبھلی صاحب کو وہاں صدر مدرس کی حیثیت سے بلا لیا گیا۔ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء میں خورجہ سے میرٹھ منتقل ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ مولانا مبارک حسین جو مولانا محمود الحسن جیسے عالم اور جیالے مجاہد کے شاگرد رشید تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک مختلف اسفار میں شریک رہے تھے، اس تحریک سے دامن کیسے بچا سکتے تھے، وہ نہ صرف یہ کہ اس تحریک میں شامل ہوئے بلکہ مجاہدانہ سرگرمیوں اور جوش عمل کے باعث قافلہ سالار بن گئے۔ انھیں ضلع میرٹھ کی خلافت کمیٹی کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں شہر کے مختلف رہنماؤں و مجاہدوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ مولانا کا نام سرفہرست تھا۔ یہ بات بھی مشہور ہے ان کی گرفتاریوں کے خلاف شہر میں بغاوت کے اعلان کے سلسلے

جامع مسجد کے میناروں پر نقارے رکھے گئے۔ اس اسکیم کے منتظمین میں مولانا بھی شامل تھے۔

اس کے بعد مولانا کی سیاسی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ دارالعلوم کے مہتمم ایک ریٹائرڈ پولیس سب انسپکٹر تھے۔ انھیں مولانا کی سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ پہلے تو انھوں نے مولانا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ملنے پر ڈرانے دھمکانے کی سعی کرنے لگے۔ مولانا کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے انھیں مدرسہ سے سبکدوش کرنے کی جرأت تو ان میں نہ تھی اس لئے ۱۹۲۷ء میں مدرسہ کے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے عوام میں انسپکٹر کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے ہی جمعہ کو مولانا مبارک حسین سے سلطان ناصرالدین محمود کی تعمیر کردہ عالی شان و وسیع جامع مسجد میں مدرسہ چلانے کی استدعا کی گئی یہ استدعا ایک عظیم الشان جلسے میں کی گئی جس میں انھیں مدرسہ کا ناظم اعلیٰ بھی مقرر کیا گیا۔ اس طرح ادارہ دارالعلوم میرٹھ کا قیام عمل میں آیا جو اب تک قائم ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا تحریک آزادی میں پورے جوش و جذبہ کے ساتھ شریک تھے اور مدرسہ کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے مدرسے کے مصارف کا بار بھی ان پر آپڑا تھا۔ انھوں نے نہایت ہمت و جرأت کے ساتھ ان حالات کا سامنا کیا۔ ایک زمانے تک انھوں نے مدرسہ سے کوئی مشاہرہ نہیں لیا بلکہ اکثر مواقع پر اپنی طرف سے مدد بھی کی۔ مدرسے کے سلسلے میں انھوں نے رنگون، ملایا، اور برما کا سفر بھی کیا اور اسے ایک یادگاری ادارہ کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہے۔ مدرسہ میں جب طلبار کی تعداد بڑھنے لگی اور عمارت کم نظر آنے لگی تو مولانا نے محلوں میں کچھ مکانات کرائے پر حاصل کر کے ضرورتوں کی تکمیل کی۔ حاکم وقت چونکہ ان سے خفا تھے اس لئے ان مکان کے مالکوں و وارثوں کو تنگ کیا جانے لگا۔ مجبور ہو کر مولانا نے شہر کے وسط میں محلہ مشائخاں میں ایک وسیع قطعہ آراضی خریدی اور ۱۹۲۵ء میں مولانا انور شاہؒ کے دست مبارک سے دارالطلبہ کا سنگ بنیاد رکھوایا اور بہت جلد اسے سہ منزلہ عمارت کی شکل دے دی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مدرسہ کی تعمیر میں غیر مسلم حضرات نے بھی عطیات دیئے۔

یہ عمارت "یادگار شیخ الہند" کے نام سے موسوم ہے جب جمعیۃ علمار ہند کا قیام عمل میں آیا تو مولانا اس سے پوری طرح وابستہ ہو گئے ابتدا میں وہ ضلع میرٹھ کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اس کے بعد مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا احمد سعید، مولانا سجاد بہاری اور مولانا مفتی محمد نعیم بھی ان کے رفقائے کار میں سے تھے۔

اس وقت میرٹھ کشاکش و کشمکش کا اہم مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف یہاں انگریزی فوج کی زبردست چھاونی تھی تو دوسری طرف انگریز پرست خاں بہادروں اور رائے بہادروں کی کمی نہ تھی۔ ان حالات میں بھی مادر وطن کے جیالے سپوت جہاد آزادی کی لو کو تیز کر رہے تھے۔ مولانا مبارک حسین بھی پیش پیش تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب جمعیۃ علمار ہند نے کانگریس کی سول نافرمانی تحریک میں شرکت کا فیصلہ کیا اور ایک بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی اور انتظام کی دیکھ ریکھ کے لئے ڈکٹیٹر بنائے گئے تاکہ سلسلہ وار گرفتاری کے مشن کو جاری رکھیں اس تنظیم میں مولانا کا نمبر چوتھا تھا۔ نمبر آنے پر انھوں نے تحریک کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ نتیجے میں خود بھی گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی یہ گرفتاری دہلی کے ایک جلسہ میں ولولہ انگیز تقریر کرنے کے دوران عمل میں آئی۔

اس کے بعد جب وائسرائے کی کونسل کی نشست کے لئے نواب زادہ لیاقت علی خان امیدوار ہوئے تو ان کے مقابلے میں جمعیت علمار ہند نے محمد احمد کاظمی کو اپنا نمائندہ بنایا اور انتخاب کی تیاری کے سلسلے میں مولانا مدنیؒ میرٹھ آئے اور دارالعلوم میں قیام کیا انھوں نے مولانا مبارک حسین کو اس الیکشن کا انچارج مقرر کر دیا۔ انھوں نے یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی اور تندہی سے انجام دیا۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے اتحادی فوجوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کا اعلان کر دیا۔ جمعیۃ علمار ہند نے اس اعلان کی مخالفت کی اور اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ مجوزہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے علاوہ ہندوستان بھر کے مقتدر علمار شریک ہوئے۔ یہ وہی تاریخی اجلاس تھا جس میں مولانا عبیداللہ سندھی برسوں کی جلاوطنی کے بعد شامل

ہوئے۔ مشہور کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر محمد اشرف بھی شریک جلسہ تھے۔ اس جلسہ میں بے مثالی بے خوفی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا گیا۔

مولانا سنبھلی علم و عمل کے پیکر اور یقین محکم کی مجسم تصویر تھے۔ ایک طرف انھوں نے ملک و قوم کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا رکھا تھا تو دوسری طرف درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے بے خبر نہ رہے۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جو آج بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس عالم باعمل نے تقریباً نصف صدی تک قوم و ملک اور علم و فن کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور خالق حقیقی سے جا ملا۔ مئی ۱۹۶۲ء میں ان پر لو کا حملہ ہوا جو فالج میں تبدیل ہو گیا۔ چند دن صاحب فراش رہ کر ۱۶؍ مئی ۶۲ء کو صبح دس بجے راہی ملک عدم ہوئے۔ دارالاقامہ مدرسہ دارالعلوم میرٹھ کے صحن میں سپرد خاک ہوئے "زینت آستان دارالعلوم" سے ان کی وفات کا سن برآمد ہوتا ہے۔ سلہ

مکرمی!

مولانا مبارک حسین محمودی سنبھلی کی حیات و خدمات پر راقم الحروف کے مضمون میں ایک اہم بات شامل ہونے سے رہ گئی تھی۔ جس کی طرف انجمن معاون الاسلام سنبھل کے مہتمم اعلا حکیم محمد احسن قاسمی صاحب نے توجہ مبذول کرائی اور وہ ہے انجمن معاون الاسلام کی تشکیل، قیام اور ترقی میں مولانا مبارک حسین صاحب کا حصہ۔ حکیم صاحب کے توسط سے انجمن کا ریکارڈ دیکھنے کا موقع ملا۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انجمن کے قیام میں مولانا کا اہم کردار رہا ہے، موصوف انجمن کے بانیوں میں سے تھے اور اس کی ترقی و توسیع میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ انجمن کی تاریخ شاہد ہے کہ مولانا مبارک حسینؒ ۱۹۱۱ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کر کے سنبھل آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یہاں آریہ سماجی ادارے مذہبی جلسوں و مناظروں میں پیش پیش تھے۔ ان جلسوں میں مسلم رہنماؤں و عالموں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے دلائل سے اسلام اور اسلام کی تعلیمات کا دفاع کریں۔ مولانا مبارک حسین نے اس ضرورت کا احساس کیا اور وطن عزیز

میں ادبیگی فرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے مذہبی ادارے کی بنیاد ڈالنے کا منصوبہ بنایا جو ہر اعتبار سے مکمل وجامع صفات ہو اور تمام دینی مکاتیب و مدارس کے لئے رہنمائی کا کام کر سکے مسلمانان سنبھل نے مولانا مبارک حسین صاحب کی آواز پر لبیک کہا اور انھیں ہر ممکن تعاون دینے کا عہد کیا۔ چنانچہ اسی سال ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا نام انجمن معاون الاسلام تجویز پایا۔

مولانا نے ادارہ کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے مشائخ و اکابر ملت کو مدعو کیا جن میں حکیم الامت مولانا تھانوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ ان اکابر نے مدرسہ کے قیام پر اظہار مسرت کیا اور اپنی دعاؤں سے اسے استحکام بخشا۔ انجمن کا کام تیزی سے آگے بڑھا۔ متعدد جلسے ہوئے، جن کی رودادیں بھی شائع ہوئیں۔ پھر ادارہ کی اپنی عمارت کے لئے سنہ ۱۹۱۳ء میں تقریباً ۵ بیگھ آراضی خریدی گئی۔ آراضی کے متصل ایک مکان بھی خریدا گیا۔ ایک صاحب خیر نے ایک قطعہ آراضی بھی ہبہ کر دی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں تعمیرات کا آغاز ہوا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں انجمن، سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ ایک جلسہ میں مولانا شوکت علی محمد علی کی والدہ ماجدہ بی اماں بھی شریک ہوئیں۔ اس تحریک کی شدت و مصروفیات نے تعمیرات کو متاثر کیا لیکن جس مبارک کام کا آغاز مولانا مبارک حسین صاحب نے کیا تھا اس کی رفتار تو سست رہی لیکن کام جاری رہا۔ مولانا سنبھل سے جانے کے بعد بھی انجمن کی سرپرستی فرماتے رہے سنہ ۱۹۴۰ء میں مولانا نے آخری بار انجمن کا انتخاب کرایا جس میں وہ جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کی وفات ہوگئی اور ادارہ ان کی سرپرستی سے محروم ہوگیا لیکن جو پودا انھوں نے دست مبارک سے لگایا تھا وہ درخت بننے کی منازل طے کرتا رہا اور اب تناور درخت بن چکا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل

مولانا محمد اسمٰعیل کا تعلق ترک برادری سے ہے سلطان التمش کے قلعہ سنبھل کے شمالی علاقہ میں ترکوں کی آبادی ہے ۱۹۰۰ء میں پیدائش ہوئی۔ والد کا نام منشی کفایت اللہ ہے جن کی ۱۹۱۴ء مولانا محمد اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہوئی پھر مدرسہ سراج العلوم میں داخل ہوئے اسی زمانے میں جلیانوالہ باغ کا انسانیت سوز واقعہ پذیر ہوا سنبھل میں بھی عام ہڑتال کی گئی اور ایک بڑا جلسہ ہوا اس میں مولانا محمد اسمٰعیل نے بھی نہایت جوشیلی تقریر کی۔ مقررو ں میں مولانا سب سے چھوٹے اور ناتجربے کار تھے اسی تقریر سے ان کی قومی زندگی کا آغاز ہوا شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی وفات کے چند ماہ بعد جب وہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں اور تیزی آئی اور وہ پرجوش تقاریر اور باغیانہ خیالات کے باعث اور دو سال قید اور بامشقت کا حکم سنایا گیا جیل میں مولانا کو سخت اذیتیں دی گئیں کولھو چلانے، چکی پیسنے کے ساتھ ساتھ پنجرے میں بھی بند کر دیئے جاتے تھے رات کو سوتے وقت ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی جاتی تھیں۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں رہائی ملی۔ قید فرنگ سے رہائی پاکر مولانا نے ادھوری تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ دی اور تقریباً ڈیڑھ سال مدرسۃ الشرع سنبھل میں فنوں کا مطالعہ کیا پھر دیوبند جاکر سید انور شمیری اور مولانا شبیر عثمانی اور دوسرے اساتذہ سے سند فراغ حاصل کی ۱۹۲۷ء کے اواخر میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا نعرہ دیا۔ ۲۶ر جنوری کو پورے ملک میں یوم آزادی منایا گیا۔ ۱۳ر مارچ کو ملک کے قانون کی خلاف ورزی کے لئے مہاتما

گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اس جمعیۃ علماء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دائرہ مربیہ قائم کیا اس سلسلہ میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مبارک حسین سنبھلی گرفتار ہوئے ان کے بعد مولانا اسمٰعیل ساتویں ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتار کئے گئے اور چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ دہلی جیل کے بی کلاس میں رکھا گیا اور ایک ماہ بعد ملتان جیل منتقل کر دیئے گئے اور مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخاب کے موقع پر مولانا یونیورسٹی بورڈ مراد آباد کے نگراں نامزد کئے گئے۔ بورڈ کے امیدوار کی کامیابی میں مولانا کا بڑا ہاتھ تھا اور ان کا اثر کافی بڑھ چکا تھا صدر صوبہ جاتی اسمبلیوں کے انتخاب کے موقع پر جب مسلم لیگ پارمانی بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو مسٹر جناح نے جمعیۃ کے بیس ممبر نامزد کئے مرکزی بورڈ کے تحت صوبہ جاتی بورڈ نے یوپی میں مولانا کو بھی شامل کیا گیا اور تحصیل بلاری سنبھل سے انھیں امیدوار بھی بنایا گیا۔ ان کے مقابلے میں معروف شخصیت عاشق حسین خاں کو کھڑا کیا گیا جو دس ہزار دیئے کے مال گزار اور بیس سال سے میونسپل بورڈ کے چیرمین تھے لیکن الیکشن میں مولانا کو فتح حاصل ہوئی اور قوم پرور طبقہ کو بڑی تقویت ملی الیکشن میں حکومت پرست جماعتوں کے مقابلے میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے امیدواروں کو شاندار کامیابی ملی لیکن کامیابی کے بعد محمد علی جناح نے حکومت نواز شخصیتوں کو پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مولانا نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اعلان کیا کہ وہ اپنے نصب العین چھوڑنے کے لئے نہیں صرف الیکشن کی غرض سے بورڈ میں شامل ہوئے تھے ان کی ولولہ انگریز تقریر کا متن مولانا مدنی کی ایک کتاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد ہی بعد مولانا باقاعدہ طور پر کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں عدم تشدد پر مبنی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی جس میں مولانا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا انجام کار انھیں مراد آباد میں گرفتار کر لیا گیا اور ۱۹ ماہ قید کی سزا ملی۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے تحت وہ پھر گرفتار ہوئے تقریباً ایک سال بعد رہائی ملی ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں انھوں نے مسلم لیگ امیدوار کے مقابلے پر

کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا اور دوسری بار ممبر چن لئے گئے۔ ممبر اسمبلی ہونے کے
بعد انھوں نے   شاہی کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی ۱۹۵۲ء کے
الیکشن میں شریک نہیں ہوئے اور جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دہلی
چلے گئے۔ چار سال خدمت انجام دینے کے بعد عمر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مستعفی ہو
گئے اور عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور درس و تدریس کے فرائض انجام
دینے لگے۔ امروہہ کے مدرسہ   شیخ الحدیث کی حیثیت سے بلا لئے گئے چار سال
وہاں مقیم رہے پھر آنند گجرات میں کم و بیش ۹ سال حدیث کے استاد کی حیثیت سے
قیام پذیر رہے آخر عمر میں وطن الوف میں خاموشی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں
معروف رہے دو کتابیں اردو میں مقادات تصوف اور دار التنزیل شائع ہو چکی
ہیں۔

سنبھل میں ہی راہی ملک بقا ہوئے اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

مولوی سلطان احمد

مولوی سلطان احمد مرحوم سنبھل کے ان مجاہدین آزادی میں سے ایک تھے جنھوں نے ساری عمر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر ملک و قوم کی خدمت کی اور گوشہ گمنامی میں جا پڑے۔ انھوں نے اس عہد کو زندگی کی آخری سانس تک نبھایا جو انھوں نے اپنے بزرگ مجاہدین تحریک آزادی سے بچپن میں کیا تھا۔

مولوی سلطان احمد مرحوم جو نصف صدی سے زاید عرصے تک ملک و قوم کی خدمت میں لگے رہے۔ ۳۰ر اگست ۸۴ء کو خالق حقیقی سے جا ملے ان کے سوانحی حالات اور خدمات پردہ خفا میں ہیں۔ پیش نظر تحریر میں ان کے مختصر حالات زندگی تحریر کیے جا رہے ہیں۔ جو ان کی تحریر میں راقم الطور کے پاس محفوظ ہیں۔

مولوی سلطان احمد کا تعلق قدیم ترک برادری سے تھا۔ وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں محلہ دیپا سرائے کے ایک ذی حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے والد کا نام جمیل احمد (مرحوم) ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم سنبھل میں ہی حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند نے شاردا بل کے خلاف امروہہ میں زبردست جلسہ کیا تھا۔ جس کی صدارت مولانا معین الدین اجمیری نے کی تھی۔ اس جلسے کے بعد جس میں سنبھل کے چند نوجوان شریک تھے، سنبھل میں کانگریس کا جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں ایک بندر کو سوٹ پہنا کر ایک آدمی کو گود میں بٹھا کر اور دونوں کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھمانے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گدھے پر ایک بورڈ لٹکانے اور اس پر وائس رائے کا آخری انجام لکھنے کی اسکیم تیار ہوئی۔

جلوس کی تیاری زور وشور سے ہوئی۔ بڑوں نے سخت مزاحمت کی۔ لیکن تقریباً ساٹھ کم عمر بچوں نے یہ مشکل کام انجام دیا۔ قلمی اشتہار لکھے گئے۔ اتفاق سے ایک پرچہ میونسپل بورڈ کے چیرمین کے ہاتھ لگ گیا۔ انھوں نے جلوس رکوانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔ جلوس کوتوالی کے سامنے سے ہوتا ہوا شہر کے بازاروں سے گذرا۔ ہر طرف ہلچل مچ گیا اور تحریک میں نئی جان پڑ گئی۔ اس وقت تقریباً سو افراد گرفتار ہوئے۔ مولانا اسمٰعیل، حافظ نور الحسن وغیرہم کے ساتھ ساتھ مولوی سلطان بھی پیش پیش تھے۔ انھوں نے پولیس کی مار بھی کھائی اور ہاتھا پائی بھی ہوئی وہ سخت زخمی ہو گئے۔ چوٹ کے نشانات مرتے دم تک ان مظالم کی یاد دلاتے رہے۔ بعد ازاں مرحوم نے دہلی میں سکونت اختیار کی اور جمعیت علماء کے دفتر میں فتویٰ نویسی اور مسجد فتح پوری میں قرآن کا درس دینے کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اسی زمانے میں جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی میں حکومت وقت کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اور مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شامل ہونے کی ترغیب دینا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ جون ۱۹۳۳ء میں چیف کمشنر دہلی نے انھیں دہلی بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا اور انھیں شام کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر ۱۲ میل دور ایک ویران اور تاریک مقام پر چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے وطن واپس آئے اور دیہی و قصباتی علاقوں میں یہی فریضہ انجام دینے لگے۔ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔

۱۹۳۷ء میں شہر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنے دور صدارت میں انھوں نے متعدد جلسوں کا انعقاد کیا۔ جس سے مسلمانوں میں کانگریس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ انھوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندو مسلم اتحاد کی بے پایاں کوششیں کیں اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ ان کی مساعی جمیلہ سے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی جوق در جوق کانگریس میں شامل ہو کر تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے لگے۔

حصول آزادی کے بعد مرحوم نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اور قرآن پاک کی تعلیم اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔

سرگرم سیاست سے کنارہ کش ہونے کے باوجود وہ آخری دم تک کانگرس نظریات کے حامی و مبلغ رہے

مرحوم مولوی سلطان احمد دلکش اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ منکسر المزاجی، شرافت نفسی، سادگی اور متانت کے پیکر، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کے آئینہ دار، جرأت و بے باکی، صداقت شعاری اور صاف گوئی کے علمبردار مولوی صاحب ساری عمر سیاست کی نظر کرنے کے باوجود سیاست سے کوسوں دور تھے۔ وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں کافی کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے عزائم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ظاہری کاموں اور سیاسی کاموں سے بہت دور رہتے تھے۔ مذہبی و دینی فرائض کی انجام دہی کے بڑے پابند تھے اور اسی کی تعلیم و ترویج میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا لیکن تنہائی و گوشہ نشینی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ تقریباً پچاس پچپن برس وطن عزیز کی گراں بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ اور ۳۰ر اگست کو راہی ملک بقا ہوئے۔ آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ اور تدفین میں سرکاری نمائندے کی حیثیت سے تحصیل دار سنبھل اور ضلع کانگرس کمیٹی (۱) قلیتی سیل کے صدر مسٹر حماد احمد ایڈوکیٹ کے علاوہ سرکردہ شہریوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

مولوی سلطان احمد کی زندگی یقین محکم اور عمل پیہم کا بہترین نمونہ تھی۔ عہد طفلی سے عہد ضعیفی تک کی ان کی داستان حیات عزم و استقلال اور قربانی و ایثار سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں نوجوانوں میں وطن پرستی اور دیش بھگتی کی روح پھونکی اور انھیں مادر وطن کی خاطر جد و جہد کرنے کی ترغیب دی اور پوری زندگی اس اصول پر کاربند رہ کر نئی نسل کو وہ راہ دکھائی جس پر چل کر ملک و قوم کی پر خلوص اور بے لوث خدمات انجام دی جا سکتی ہیں۔ ایسے لوگ اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ تحریک آزادی کا اہم مرکز سنبھل بھی آہستہ آہستہ وطن پر دیوانہ وار نثار ہونے والے سپوتوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ لالہ چندو لال چودھری، ریاست علی خاں، لالہ روپ کشور آزاد ہندوستان میں چند سال ہی جی سکے۔ مولوی عبدالوحید، مولانا محمد اسمٰعیل، منشی معین الدین انصاری، لالہ چیتن سروپ گزشتہ

رہائی میں رخصت ہو گئے

مولوی عبد الحق، مولانا عبد القیوم، مولوی نور الحسن اللہ ان کی عمر دراز کرے، ان سرفروشان وطن کی بہترین یادگاریں ہیں۔ تینوں مجاہدین آزادی گوشہ نشینی کی زندگی بتا رہے ہیں۔ ہم میں اتنی قومی غیرت کہاں ان عظیم المرتبت قومی شخصیتوں کی قدر کریں اور ان کی تقلید کا فخر حاصل کر کے مادر وطن کی ترقی و خوش حالی کے لئے سرگرم عمل ہوں۔

حافظ شیخ نورالحسن

جہادِ آزادی کے ایک اہم مرکز سنبھل کے ایک اور سرگرم بزرگ مجاہد آزادی حافظ نورالحسن اتوار ۶ر نومبر کو تقریباً اسّی سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی شہر میں غم واندوہ کی فضا جاری ہو گئی اور سینکڑوں شہریوں نے اشکبار نگاہوں سے اپنے جیالے، نڈر اور محب وطن سپوت کو الوداع کہا۔

حافظ نورالحسن سنبھل کے قدیم شیخ ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد کا نام شیخ امانت اللہ اور دادا کا اسم گرامی شیخ کریم اللہ تھا۔ یہ بڑے زمیندار گھرانوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اجداد کا تعلق سنبھل سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع موضع فیروز پور سے تھا۔ یہ موضع کسی زمانے میں تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ سوت ندی کے کنارے، شمال کی جانب آباد اس خطے میں ایک قدیم قلعہ اور مسجد آج بھی اپنے شاندار ماضی کی داستان سنا رہی ہے۔ حافظ جی کے بزرگ اسی فیروز پور سے ترک سکونت کر کے سنبھل کے محلہ میاں سرائے میں آباد ہوئے۔ شیخ امانت اللہ کے چار بیٹے ہوئے۔ نورالحسن سب سے چھوٹے تھے جو ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں مذہبی و دینی ماحول غالب تھا۔ دونوں بڑے بھائی بھی حافظ قرآن تھے۔ انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم اسلامی مدارس میں حاصل کی اور قرآن پاک حفظ کیا بعد ازاں اردو اور فارسی کا مطالعہ بھی کیا تکمیل تعلیم کے دارج طے نہ کئے تھے اور سنِ بلوغ کا آغاز ہی تھا کہ مادر وطن کو غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے کی تحریک سے متاثر ہوئے اور مذہب

وملت کی خدمت کے ساتھ ساتھ آزادی وطن کی خاطر سرگرم عمل ہو گئے۔ اردو ان کی مادری زبان بھی تھی اور حریت و انقلاب کی ترغیب و تحریک دینے کا ذریعہ بھی۔ راقم الحروف کے نام ایک تحریر میں انھوں نے لکھا ہے :۔

" میری سیاسی زندگی میں اردو زبان کو خاص دخل رہا ہے۔ اس کی ترقی کے لئے مالی امداد بھی کی۔ تحریک آزادی کے دور میں اردو میں سیاسی نظمیں لکھوائیں جو جلسوں و جلوسوں میں پڑھی گئیں جو بہت با اثر ثابت ہوئیں اور زبان زد خاص وعام ہو گئیں۔ میرے محلے کے محترم بزرگ حاجی حافظ رحیم بخش تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں چند نظمیں لکھیں۔ ایک نظم کے دو شعر یاد ہیں پیش کر رہا ہوں۔

الٰہی سلطنت برطانیہ برباد ہو جائے
غلامی دور ہووے ہند سے، آزاد ہو جائے
چلائیں گولیاں بے جرم ظالم نے پیشاور میں
خدا غارت کرے بیکار تو حداد ہو جائے "

یہی وہ انقلاب آفریں زمانہ تھا کہ جب دیگر سرفروشان سنبھل کے ساتھ حافظ نور الحسن بھی میدان عمل میں آئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیت علماء کی جانب سے شاردا بل کے خلاف امروہہ میں ایک عظیم الشان اجلاس مولانا معین الدین اجمیری کی زیر صدارت ہوا جس میں مولانا عطا اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے بھی شرکت کی تھی۔ حافظ جی اپنے رفقا کے ہمراہ اجلاس میں شریک ہوئے اور بل کی مخالفت میں جو قرار داد منظور ہوئی اس کو عملی جامعہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا۔ سنبھل میں حافظ نور الحسن اور ان کے نوجوان ساتھیوں نے کانگرس کی جڑیں مضبوط کرنے اور اس کا پیغام گھر گھر پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ ان نوجوانوں میں پانچ ساتھیوں کے بارے میں ایک نظم گلی گلی گونج رہی تھی جس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

عزیز، ذوالفقار، شبیر، سعادت، نور کے صدقے
بڑوں کو شرم آنا چاہئے ان پانچ کے صدقے

اسی مہم کے دوران ان لوگوں نے شہر میں کانگرس کا جلوس نکالنے کا فیصلہ

کیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ انگریز حاکموں کی نگاہیں تو ٹیڑھی ہی تھیں بعض اپنوں کا رویہ بھی معاندانہ تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ ایک سوٹ پہنے ہوئے شخص کی گود میں ایک بندر بیٹھا کر ان کو گدھے پر سوار کیا جائے اور ایک بورڈ پر "وائسرائے کا آخری انجام" لکھ کر جلوس کے ساتھ ساتھ گھمایا جائے۔ جلوس کی تیاری شروع ہوئی، سو سے زائد جھنڈے تیار کئے گئے۔ بندر پکڑنے کی کوشش کی گئی تو ناتجربے کاری کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ ایک لالہ جی سے بندر مانگا گیا۔ چھوٹے رضا کار ایک گدھا پکڑ لائے۔ قلمی اشتہار لکھے گئے اور جلوس نکلنے کا بندوبست مکمل ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک قلمی اشتہار چیئرمین کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ انھوں نے بردبار لوگوں کو طلب کر کے جلوس نہ نکالنے کا حکم دیا۔ بزرگ ویسے ہی کم ہمت تھے، چیئرمین کا حکم ٹالنے کی مجال ان میں نہیں تھی لیکن نوجوانوں و بچوں کا جذبہ حریت دبانے سے دبنے والا نہ تھا۔ بمشکل تمام دو بجے دن کو جلوس نکلا۔ بندر اور گدھا شامل نہیں کئے جا سکے۔ تقریباً ساٹھ بچے اور نوجوان کارواں لے کر چلے، انگریزوں کے خلاف نظمیں پڑھی گئیں۔ نظم خوانی میں محمد اسماعیل نے جو بعد میں مولانا محمد اسماعیل کی حیثیت سے مشہور ہوئے، مرکزی رول ادا کیا۔ جلوس کوتوالی کے سامنے سے ہوتا ہوا چیئرمین صاحب کے دولت کدے کے سامنے سے بھی گذرا۔ نوجوان مجاہدین آزادی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، آزادی کی لو تیز ہوئی، کانگرس کی تحریک کو جلا ملی اور آزادی وطن کے جذبات بیدار کرنے اور غلامی کے خلاف نبرد آزما ہونے کا پیغام گھر گھر پہنچانے کی غرض سے کانگرس کے بڑے بڑے جلسوں کا انعقاد ہوا جن میں انگریزوں کے خلاف پرجوش تقریریں کی جاتی تھیں اور وطن کی خاطر میدان عمل میں آنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنبھل تحریک آزادی کا سرگرم مرکز بن گیا۔ اور انگریز حکام بدلے و انتقام کی آگ میں جلنے لگے۔ اسی سال شیخ نورالحسن کو گرفتار کر لیا گیا۔ سبب یہ تھا کہ انھوں نے بہت بڑے جلوس کی رہنمائی کی جو کوتوالی تک گیا۔ ہجوم نے ان سے تقریر کرنے کی فرمائش کی۔ کوتوال اس مانگ کے خلاف تھا اس نے ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ مارپیٹ کی نوبت آگئی۔ حکومت نے اس واقعہ کو بلوا قرار دے کر اور غداری کا الزام لگاتے ہوئے

اندھادھند گرفتاریاں شروع کر دیں۔ تین سو سے زائد افراد گرفتار کیے گئے۔ نورالحس
صاحب کو معافی مانگنے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن انھوں نے ہر ظلم سہا پر معافی نہیں مانگ
مقدمات میں پھنسا دیئے گئے اور چھ ماہ کی سزا نیز پچاس روپیہ کا جرمانہ عائد کیا گی
اس کے علاوہ بلوہ کرانے کے جرم میں چار ماہ کی سزا بھی دی گئی۔ شیخ نورالحسن کو سی
کلاس میں رکھا گیا اور سخت محنت و مشقت کے کام لیے جاتے تھے۔

سزا کی مدت گذرنے کے بعد حافظ جی 'ذوق گنہ' میں اور اضافہ ہوا۔
وہ ہر مشکل کا سامنا کرتے اور ہر آزمائش پر پورے اترتے اپنے مشن کی تکمیل میں
لگے رہے۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں انھیں ڈیڑھ سال کی سزا ہوئی اور دو سو روپے
کا جرمانہ ہوا۔ اس بار انھیں بی کلاس دیا گیا۔

حصول آزادی کے بعد حافظ نورالحسن نے خوددار، تنہائی پسند اور بے غرض
مجاہدین وطن کی طرح عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ جب تک سرگرم
و مخلص کارکنوں کو یاد کیا جاتا رہا ان کی بھی پذیرائی ہوئی۔ وہ تقریباً دس سال
تک ضلع پریشد کے رکن اور شہر کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے۔ اترپردی
سرکار نے انھیں سیاسی پنشن بھی دی اور تام پتر بھی۔ مرکزی حکومت کی طرف سے
بھی پنشن دینے کا فیصلہ ہوا۔ جو تا حیات جاری رہی۔

تحریک آزادی میں سرگرم شرکت و قیادت کے ساتھ ساتھ حافظ نورالحسن
نے دین و مذہب کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ انھوں نے نصف صدی قبل
میاں سرائے میں ایک مکتب "حمایت الاسلام" کے نام سے قائم کیا تھا۔ مکتب
میں دینی و مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو پڑھانے کا انتظام بھی ہے مرحوم آخری عمر تک
مکتب کے مہتمم کی حیثیت سے دینی تعلیم کے فروغ میں لگے رہے۔

حافظ نورالحسن منکسرالمزاج، پابند صوم صلوٰۃ اور نیک نفس انسان نیز
سچے، باعمل و مخلص محب وطن مسلمان تھے۔ ان کی داستان حیات قربانی و ایثار، خدمت
خلق و خدمت دین اور وطن پرستانہ جذبات سے عبارت ہے۔ وہ جب تک جیے، قوم
و ملک کے لئے جیے۔ اور آخری سانس تک اسی روش پر قائم رہے۔ ادہر کچھ عرصہ سے
بیمار تھے، اتوار ۶؍ نومبر کو فرشتہ اجل کو لبیک کہا۔ دوشنبہ ۷؍ نومبر کو سپرد خاک

ہوئے اور سینکڑوں سوگواروں نے بادیدہ نم انھیں رخصت کیا۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بقیہ مولوی عبدالوحید

↓

کی طرح سنبھل میں بھی غیر ملکی سامراج کے خلاف نفرت و غصے کی آگ پھیلتی جارہی تھی دیگر سرفروشوں کی طرح مولوی عبدالوحید بھی سرگرم مجاہد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں پیچھے نہ تھے۔ انھوں نے جہادِ آزادی کی ترغیب دینے اور تحریک کو تیز تر کرنے کی غرض سے رنگون، مالٹا اور برما کے سفر بھی کئے اور ملک کے اکابر رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔ انگریز حکمرانوں کو ان کی حب الوطنی اور مجاہدانہ سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے، غلامی کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے اور ان میں حصول آزادی کی خواہش پیدا کرنے کے جرم میں انھیں ۱۹۳۰ء میں جیل کی آہنی سلاخوں میں بند کر دیا گیا۔ جیل میں ان کو مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا اور اپنے مشن سے دست بردار ہونے کی ترغیب دی گئی۔ انھوں نے ہر طرح کے حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا لیکن جو قدم آگے بڑھایا تھا اسے پیچھے نہیں ہٹایا۔ چار ماہ کی قید مشقت جھیلنے کے بعد رہا کئے گئے۔ رہا ہونے کے بعد پھر اپنے کاز کی خاطر سرگرم عمل ہو گئے اور یہ سلسلہ حصول آزادی تک جاری رہا۔

آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد مولوی عبدالوحید نے سرگرم سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور گوشہ تنہائی میں ملک و قوم کی خاطر کوشاں رہے۔ خاموش خدمت کا یہ عمل زندگی کی آخری سانس تک جاری رہا۔ ۱۸ / اکتوبر ۱۹۷۲ء کو تحریک آزادی کا یہ سرگرم مجاہد ہمیشہ کے لئے قید حیات سے بھی آزاد ہو گیا۔ آبائی قبرستان واقع پختہ باغ حسن پور روڈ میں سپرد خاک کئے گئے۔ ہزاروں سوگوار آنکھوں نے اپنے محبوب مجاہد کو الوداع کہا۔

مولانا عبدالقیوم سنبھلی

مولانا عبدالقیوم سنبھلی کے قدیم ترین ترک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں سلطان التمش کے قلعہ سنبھل کے شمالی علاقہ میں ترکوں کی گھنی آبادی ہے۔ یہیں ۱۹۰۶ء میں مولانا کی پیدائش ہوئی۔ والد کا نام منشی کفایت اللہ ہے۔ مولانا عبدالقیوم ابھی ۸ برس کے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ قمرالنسار صاحبہ نہایت دیندار، متقی، پرہیزگار اور روشن خیال خاتون تھیں۔ ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اپنے بچوں کو بھی انھوں نے یہی تعلیم دی۔ بڑے بیٹے مولانا محمد اسمٰعیل بھی قابل فخر مجاہد آزادی تھے، وہ ممتاز عالم دین اور سرگرم سیاسی رہنما تھے۔ مولانا اسمٰعیل جمعیت علمائے ہند کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہوئے، ریاستی اسمبلی کے ممبر بھی چنے گئے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے اور بہترین مقرر و خطیب بھی۔ قومی خدمات کے اعتراف میں انھیں ریاستی حکومت کی جانب سے نام پتر بھی دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالقیوم والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی کی نگرانی میں پروان چڑھے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی پھر مشہور مدرسہ سراج العلوم ہلالی سرائے میں داخل ہوئے۔ بعد ازاں مرادآباد کے مشہور و معروف مدرسہ شاہی قاسم العلوم میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا کی عمر صرف چودہ سال تھی، مرادآباد کے ہندو کالج میں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر نے خطاب کیا تو وہ بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے جلسہ میں شریک تھے۔ یہیں سے ان کے دل میں تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے کا جذبہ بیدار ہوا اور وہ ملک کو غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے کے لئے میدان عمل میں آگئے۔ مولانا محمد علی کی تقریر سننے کا ہی اثر تھا کہ وہ اسی دن سے مرادآباد، کاشی پور اور

قرب و جوار کے علاقوں میں جوشیلی تقاریر کے ذریعہ عوام میں جذبہ حب قومی بیدار کرنے لگے۔ ان کی پر اثر تقاریر اور جوش عمل کے نتیجے میں ہزارہا افراد تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں وطن واپس آکر باقاعدہ علم بغاوت بلند کر دیا اور یہاں کی سڑکوں، چوراہوں اور عوامی مقامات پر حکومت مخالف تقاریر کر کے تحریک آزادی کو عوامی بنانے کے کام میں جٹ گئے۔ سینکڑوں فدائیان وطن میدان کارزار میں نکل آئے۔ لالہ چندو لعل، ماسٹر روپ کشور، چودھری ریاست علی خاں اور مولانا محمد اسمٰعیل کی رہنمائی میں سنبھل میں تحریک آزادی زور پکڑ گئی۔ ۱۹۲۲ء میں ان چاروں اصحاب کو دو سال کے لئے مراد آباد جیل میں قید کر دیا گیا۔ اس وقت سنبھل میں تقریباً ۵ ہزار والینٹر قومی تحریک میں شامل تھے اور مولانا عبدالقیوم ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چوراچورا واقعہ کے بعد مہاتما گاندھی نے تحریک واپس لے لی اور مولانا تکمیل تعلیم میں جٹ گئے۔ ۱۹۲۴ء میں دہلی کے مدرسہ فتح پور مسجد میں داخل ہوئے اور چار سال میں فراغت حاصل کر کے وطن واپس آ گئے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ پھر عملی جہاد میں شریک ہوئے اور نیشنل کانگرس کی تنظیمی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ۱۹۳۰ء میں منشی معین الدین انصاری جن کے دادا منشی امام الدین کو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران بہادر شاہ ظفر کی مدد کرنے کے جرم میں چونے کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا اور مولوی عبدالوحید مرحوم، پنڈت واسدیو رگھو نندن شرما، مولوی نورالحسن، ہر پرشاد وکیل، رام رتن، پنڈت پرہلاد کمار جیسے معروف معززین شہر بھی تحریک کے سرگرم کارکن بن گئے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۰ء کو مولانا عبدالقیوم اور لالہ چندو لعل کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ ۹ر مارچ کو گاندھی ارون معاہدے کے تحت رہا کر دیئے گئے۔ اس تحریک کے دوران سنبھل میں سینکڑوں افراد گرفتار کئے گئے، ان پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا تھا۔ میاں سرائے کے ایک مجاہد بشیر احمد کو جام شہادت بھی نوش کرنا پڑا۔ سینکڑوں بے خانماں و برباد ہوئے۔ رہائی کے بعد مولانا نے معاشی مسائل کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۳۴ء میں مدرسہ محمدیہ سنبھل میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور کانگرس کی تشکیل و تنظیم میں بھی کوشاں رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ہی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ہمراہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے چندہ مہم میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۳۵ء میں کانگرس کی پولیٹیکل کانفرنس

میں، جس کی صدارت پنڈت گووند بلبھ پنت نے کی تھی، خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ ۱۹۳۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہوئے تاریخ ساز الیکشن میں بہت کام کیا۔ بلاری حلقہ کا انتظام انھیں کے ذمہ تھا۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے کانگرس کے حق میں فضا ہموار کی اور کانگرس کے امیدوار مولانا اسمٰعیل کو کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ضلع کانگرس کمیٹی کی تنظیمی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے مرادآباد منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں تحریک کے دوبارہ شروع ہونے پر سرگرم عمل ہو گئے۔ اس وقت مولانا ضلع کانگرس کے آفس سکریٹری تھے۔ ۱۹۴۱ء میں ڈکٹیٹر مقرر ہو گئے اور پروفیسر رام سرن، پنڈت شنکر دت، داودیال کھنہ، لالہ رام غلام، چودھری شیوسروپ سنگھ، مولانا سید محمد میاں، کارینڈ ابراہیم، قاری عبداللہ وغیرہم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلہ میں مولانا کو بعض بعض دفعہ ۳۰۔ ۴۰۔ ۴۴ میل تک پیدل سفر کرنا پڑتا تھا لیکن وہ کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ ۲۲ر فروری کو انھیں بھی ڈی۔ آئی۔ آر کے تحت چھ ماہ سخت ۳۵ روپیہ جرمانہ کی سزا ملی اور ۲۶ر فروری کو بریلی جیل بھیج دیئے گئے۔ جولائی ۴۱ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ جیل سے آنے کے بعد پھر تنظیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے۔ اگست ۴۲ء کی "انگریزوں بھارت چھوڑو تحریک" میں ضلع کی رہنمائی ان کے سپرد ہوئی۔ وہ زیر زمین ہو کر رہنمائی کرتے رہے۔ اسی دوران ان کی بہادر ماں کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی مولانا محمد اسمٰعیل ۹ر اگست کو ہی نظربند ہو چکے تھے اور وہ خود روپوش ہو کر رہنمائی کر رہے تھے۔ دونوں بیٹے ماں کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکے۔ یکم ستمبر ۴۲ء کو سنبھل ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کا محاصرہ کر کے مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈی۔ آئی۔ آر کے تحت مرادآباد جیل میں نظربند ہو گئے۔ مرادآباد ڈسٹرکٹ جیل اس وقت ممتاز مجاہدین و رہنماؤں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہاں مولانا حسین احمد مدنی رح، حافظ محمد ابراہیم، مولانا حفظ الرحمٰن رح، مولانا محمد میاں رح جیسے مشاہیر کی رفاقت نصیب ہوئی۔ ۱۴ر ماہ کی نظربندی کے بعد دسمبر ۱۹۴۳ء میں سبھی کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد مولانا پھر کانگرس کی تنظیمی ذمہ داریوں کو نبھانے میں لگ گئے۔ ۱۹۴۵ء میں کانٹھ میں سیوادل ٹریننگ کیمپ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں کانگرس کی انتخابی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے اور کانگرس

کے بلاری حلقہ کے انچارج بنائے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد، کانگرس کے حق میں فضا ساز گار کرنے اور فرقہ پرستی کی طوفانی لہروں کو ختم کرنے کے لئے میدان عمل میں آئے۔ اسی دوران صوبہ کانگرس کمیٹی کے رکن چنے گئے اور ۱۹۵۵ء تک مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ وہ بھوران تحریک کے رکن بھی ہوئے۔ پارٹی کے مختلف عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور عام کارکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔۔ ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا، کانگرس مخالف عناصر کے ساتھ ساتھ، کانگرس میں گھسے ہوئے فرقہ پرست عناصر کا خندہ پیشانی مقابلہ کیا۔ متعدد بار ناخوش گوار حالات اور نامساعد ماحول کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ قومی و ملکی کاموں اور تحریک آزادی میں سرگرم حصّہ لینے کی وجہ سے کبھی گھر کے مسائل کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ گھر میں ناگفتہ بہ حالات بھی پیدا ہوئے سخت مرحلے بھی آئے لیکن ان کی بہادر ماں اور وطن پرست بیوی نے زبان سے اف تک نہ کی۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۸ء کے صبر آزما حالات میں ماں نے رات دن چرخا کات کر گھر کا خرچ چلایا اور بچوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ ۱۹۲۸ء سے مولانا کی رفیقہ حیات بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، معروف کار رہیں۔ ۴۲ء کے بعد سے تنہا ہی گھریلو مسائل اور ذمہ داریوں سے نبرد آزما رہیں اور بچوں کی نگہداشت، شوہر کی دیکھ بھال اور مجاہدین کی امداد کے لئے   لگائے رہیں۔ ساری ساری رات چرخہ کات کر گزارتیں اور دن میں بچوں کی تربیت و نگہداشت میں معروف رہتیں۔ مولانا کی عدم موجودگی کی وجہ سے سخت حالات سے دو چار ہونا پڑتا لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ ایک وقت تو وہ بھی آیا کہ اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے۔ مولانا کے چار بچے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۴ء کے دوران صحیح علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے راہی ملک عدم ہوئے۔ ایک بچی کی عمر تو گیارہ برس تھی۔ ان صدمات کو بھی صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور پوری توجہ ان دو بچوں کی تربیت و تعلیم پر دی۔ لڑکا جس کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں ہوئی حصول تعلیم کے بعد برسر روزگار ہو گیا اور لڑکی جو ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئی۔ بی اے بی ایڈ کرنے کے بعد درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔

۱۹۷۲ء میں مولانا عبد القیوم حج بیت اللہ سے بھی فیضیاب ہوئے۔ ۷۶

سال کی عمر میں بھی مولانا کے معمولات میں فرق نہیں آیا ہے۔ گو چہ وہ زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں صرف کرتے ہیں لیکن اب بھی ان میں جوانوں سے زیادہ حوصلہ اور کام کرنے کی لگن ہے۔ قومی تقریبات میں وہ جوش و خروش سے شریک ہوتے ہیں۔ اور پرجوش خطابت سے محفل کو گرما دیتے ہیں۔ مولانا عبدالقیوم نہایت خوددار اور وضعدار ہیں۔ نمود و نمائش اور حصول اقتدار سے دور رہتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستی حکومت نے انھیں ۲۵ روپیہ ماہوار سیاسی پنشن دینا منظور کی تھی۔ ۱۹۷۲ء سے مرکزی حکومت کی جانب سے بھی سیاسی پنشن ملنے لگی ہے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش ہے اور یہی سرمایہ۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں انھیں ریاستی حکومت کی جانب سے مجاہد آزادی کا "تامر پتر" بھی دیا گیا۔

مولانا عبدالقیوم اب بھی کانگرس سے وابستہ ہیں اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے پرجوش حامیوں میں سے ہیں لیکن انھیں کانگرس کی آپسی رسہ کشی اور اختلافات کا گہرا دکھ ہے۔ سیاست کی گندگی کی وجہ سے، عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور اپنے آبائی مکان واقع دیپا سرائے میں قیام پذیر ہیں۔

مولانا عبدالقیوم کی داستان حیات جتنی عبرت خیز ہے اتنی ہی سبق آموز بھی۔ یہ ہماری کتنی بدنصیبی ہے کہ جن لوگوں نے ملک و قوم کی سچی خدمت کی ہے اور بے مثال قربانیاں دی ہیں انھیں فراموش کر دیا گیا ہے اور جو لوگ دنیاداری کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ترقی و خوش حالی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

شیخ تاج الدّین سنبھلی

شیخ تاج الدین اپنے عہد کے ان عالموں میں سے تھے، جن کی فضیلت و مرتبے کا اعتراف ایک عالم میں کیا جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے:۔

"شیخ تاج الدین سنبھلی کہ اوّل خلفائے حضرت خواجہ بودند دور آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ ہمانجا مدفون شدند و ایں فیصر از متاخران مشائخ اہل ہند، ہیچ کس راندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد او باشند۔ کرامات وے روایت کنند۔ دربیان اشغال باقیہ کہ ہماں طریقہ نقشبندیہ است بے افراط و تفریط۔ رسالہ عربیہ دارند و حضرت ایشاں (والد من) ترجمہ آں رسالہ فارسیہ نوشتند ملتقط از عبارات سلف۔ ایں فیقر ایں ہر دو را بخدمت حضرت ایشاں گزراندہ والحمد للہ۔"

شیخ تاج الدین جن کے اشغال نقشبندیہ کے متعلق عربی رسالے کا فارسی ترجمہ شاہ عبدالرحیمؒ نے کیا تھا، خواجہ باقی اللہ کے سب سے پہلے مرید تھے۔ وہ ان کے حلقہ ارادت میں اس وقت داخل ہوئے، جب حضرت خواجہ بزرگوں کی تلاش میں سنبھل آئے تھے۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد وہ بلاد عرب چلے گئے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے جن کی عمر کا بیشتر حصہ یمن، حجاز اور مصر میں گزرا، نفحۃ القدوسیہ میں لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین نے بصرہ، یمن، احسا، نجد اور حجاز میں طریقہ نقشبندیہ کو پھیلایا۔ ان علاقوں میں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔

شیخ تاج الدین نے عربی میں متعدد کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ اہل عرب میں نقشبندیہ سلسلے کو فروغ دینے اور اس کا پیغام عام کرنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس موضوع پر ان کی گرانمایہ تصنیف الرسالہ فی سلوک خلاصۃ السادات نقشبندیہ

بہت مشہور ہوئی۔ عبد الغنی النالوسی نے اس کتاب کی شرح "مفتاح المعیت فی طریقة النقشبندیہ" کے نام سے لکھی۔ شیخ تاج الدین نے پیری مریدی کے جواز میں اور منکرین کو قائل کرنے کے لئے ایک عربی رسالہ بھی لکھا۔ تصوف کی مشہور کتب "نفحات الانس" مصنفہ ملا واعظ کاشفی وغیرہ کا عربی ترجمہ بھی کیا۔

حجاز میں شیخ صاحب کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اعیان و اکابر حرم شیخ محمد علاّن کے ان کے حلقہ ارادت میں آجانے کی وجہ سے ان کی اہمیت دوچند ہو گئی اور شیخ الشیخ علاّن کے خطاب سے معروف ہوئے۔

حجاز میں کچھ عرصے کے قیام کے بعد شیخ تاج الدین ہندوستان چلے آئے لیکن تھوڑی مدت کے بعد واپس ہو گئے۔ اور اپنی عمر کا طویل حصّہ حجاز اور عربستان میں گزارا۔ وہ بصرہ و کوفہ جب آخری بار گئے تو حاکم بصرہ بھی ان کے معتقدین میں شامل ہو گیا۔ عمر کے آخری حصّے میں بیت اللہ شریف کے نزدیک آراضی خریدی اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

شیخ تاج الدین ننانوے سال کی عمر میں ۱۰۵۲ھ میں راہی ملک عدم ہوئے۔ اور مکہ معظمہ میں سپرد خاک ہوئے۔

عصر حاضر کے اکابر سنبھل

مذہبیات و ادبیات

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
حضرت مولانا محمد برہان الدین
حضرت مولانا عبد المقتدر
حضرت مولانا اختصاص الدین
حضرت مولانا محمد عثمان رضوی
حضرت مولانا محفوظ سنبھلی
حضرت مولانا عارف سنبھلی
حضرت مولانا عتیق الرحمٰن
حضرت محمد حفیظ نعمانی
پروفیسر خواجہ عبد الحیٔ
ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
ڈاکٹر محمد صبیح الدین انصاری
ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی
حضرت مولانا سجاد نعمانی
ڈاکٹر صابر حسین صابر
ڈاکٹر شیخ تنزیل احمد
حکیم ظل الرحمٰن سنبھلی
جناب سید آفتاب علی

مولانا عبد السلام قاسمی
ڈاکٹر عارف الاسلام
ڈاکٹر نسیم الظفر باقری
مولانا اسعد اسرائیلی
جناب این رحمان سنبھلی
مولانا عبد المعید ترینوی
مولانا عمران ذاکر قاسمی
جناب نیر اسرائیلی
جناب جاوید سنبھلی
جناب عبد الودود خاں
جناب محمد سعد نعمانی
جناب محمد عبد القادر
محترمہ کشور زیدی

شعر و سخن

احسن : سید احسن اختر
اختر : خواجہ اختر حسین
اختر : غلام الثقلین عابدی
اعجاز : اعجاز حسین چشتی

اعجاز : اعجاز حسین وارثی
افسر : جلال الدین
افسر : سید حسین افسر
افضال : افضال احمد
الم : سمیع اللہ
انجم : شریف احمد
انجم : ممتاز حسین
انور : انور حسین اسرائیلی
آہ : سید اظہر حسین
آہ : مطلوب حسین
برق : ڈاکٹر شفیق الرحمان
بخار : عطاء اللہ خاں
بیکل : سید محمد اطہر
بہادر : سید صدیق علی
پرویز : پرویز عالم
تسلیم : رئیس احمد
ثمر : ریاض احمد
جمیل : جمیل احمد ددشی
حاصل : محمد حنیف
خالد : محمد نعمان
خلیل : خلیل الرحمان
خواجہ : مناظر الاسلام
دلدار : نفیس الدین خاں
رازی : حکیم رئیس احمد
راشد : محمد راشد عزیزی

راہی : محمد رفیق
راہی : عبدالسمیع
رفعت : رفعت عالم
شجاعت : شجاعت حسین
شفیق : اشفاق احمد خاں
شفیق : فضل الرحمان انصاری
شکیل : محمد شکیل جعفری
شیدا : زوار حسین
صابر : صابر حسین
صبا : عرفان احمد انصاری
صغیر : صغیر احمد اشرفی
صغیر : وضاحت عالم
صولت : خواجہ صولت حسین
طاہر : طاہر رزاقی
طبی : بہادر حسین
ظفر : ظفر اللہ خاں
عاکف : رضاء الرحمان
عرشی : محمد کثیر
عرفان : ڈاکٹر عرفان منصوری
عقیل : سید عقیل احمد
غالب : غالب حسین
غضنفر : غضنفر اللہ
فاضل : سید محمد فاضل
قدیر : قدیر احمد خاں
قفس : مجاہد حسین

قمرؔ : سلطان الدین
قیصرؔ : سمیع الرحمان
قیومؔ : قیوم راہی
کلیمؔ : محمد سلطان خاں
کیفیؔ : اقبال قاسم
گھائلؔ : انیس احمد
مخمورؔ : ابرار حسین
مرغوبؔ : مرغوب حسین
مزملؔ : مزمل خاں
مسرورؔ : محمد رضوان نعمانی
مسعودؔ : نوابزادہ مسعود حسین
مصورؔ : ظفر علی سبزواری
مضطرؔ : سعید احمد
معجزؔ : سید معجز حسین
ممتازؔ : ممتاز حسین

منشیؔ : عظیم الرحمان
منصورؔ : ڈاکٹر منصور حسین
نازکؔ : محمد اشرف
نجمؔ : نجم جاوید عثمانی
نسیمؔ : نسیم الظفر باقری
نصرتؔ : نصرت علی خاں
نظامؔ : نظام الدین خاں
نفیسؔ : ڈاکٹر نفیس علی
نقوی : سید مراد حسین
نورؔ : عبدالرحیم وارثی
واالدؔ : تصدیق الہٰی
ورماؔ : رام چندر سنگھ
وفاؔ : ڈاکٹر مشرف حسین
وقارؔ : وقار احمد رومانی
یاورؔ : یاور علیگ

سیاسیات وسماجیات

مولانا محمد اسحاق سنبھلی
نواب محمود حسین خاں
نواب ساجد حسین خاں
ڈاکٹر شفیق الرحمان برق
جناب شریعت اللہ
چودھری مشرف علی خاں
الحاج ظریف حسین
حکیم محمد احسن قاسمی
جناب رام کمار گپتا
حکیم رئیس احمد
ڈاکٹر برج بھوشن رستوگی
جناب عماد احمد ایڈوکیٹ
جناب ظریف الاحسان
ڈاکٹر بی بی ایل اگروال
ڈاکٹر مول چند دالبھ
اچاریہ نکیتش ماتھر
ڈاکٹر رام ناتھ پاٹھک
ڈاکٹر دیوکی نندن شرما
ڈاکٹر محمد خالد قاسمی
ڈاکٹر محمد احسان
نواب زادہ خالد حسین خاں

ڈاکٹر امیش چندر سکسینہ
ڈاکٹر دھن پرکاش گرگ
جناب ہریش چندر گرگ
جناب محمد راشد
چودھری اظہر علی خاں
شیخ مسعود الحسن
لائق مسعود الحسن
ماسٹر معراج الاسلام
نوابزادہ اقبال محمود
شیخ محمد اسلم
ماسٹر خلیق احمد
عبدالرحمان ایڈوکیٹ
تصدیق الہٰی زبیری
ڈاکٹر ضیاء الدین ترینوی
جناب محمد ادریس خاں
ماسٹر مقصود احمد
جناب دلدار دولھا
جناب مقرب حسین
سید منظر حسنین
امین الرحمان
سرفراز محمد خاں